**DATE LABEL**

15 DEC 1971
30 DEC 1972

Text Book

12.2.77

95 (NS)

17/8/87

...all No.

Date

...c. No.

K. UNIVERSITY LIBRARY

This book should be returned on or before the last ...stamped above. An over-due charge of *.06 P.* will be ... for each day. If the book is kept beyond that day.

329

# مضامین فرحت

## حصہ اول

Centy

# مضامین فرحت

## حصّہ اوّل

## مرزا فرحت اللہ بیگ

مرتبہ

شمیم انہونوی۔ ایم۔ اے
لکچرار شعبۂ اردو
حلیم مسلم ڈگری کالج۔ کانپور

شیخ غلام محمد اینڈ سنز تاجران
"قرآن منزل"
بازار امیرا کدل سرینگر کشمیر

U 9
225 فہ م
۲۲۵ ف م
CHECKED
J. & K. UNIVERSITY LIB.
Acc. No 56290
Date 2.3.65
ST
ALLAMA IQBAL LIBRARY
56290

قیمت

تین روپے

ناشر

مکتبہ کلیات۔ بشیرت گنج۔ لکھنؤ
ٹیلیفون ۔ ۵۷۲۵ ۔

تعداد اشاعت ۵۰۰ پرنٹر:۔ الائیٹ پرنٹرس لکھنؤ (النواعظ صفدر پریس)

# فہرست مضامین

مضامین فرحت حصہ اول مختلف یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل ہے لیکن ہندوستان میں ملتی نہیں۔۔ پاکستان سے کتابوں کی آمد پر ایسی پابندیاں ہیں کہ وہاں سے کسی کتاب کا منگا کر فروخت کرنا جوئے شیر لانے سے کم دشوار نہیں۔۔ ایسی صورت میں طلباء کی مشکلات کے پیش نظر مکتبۂ کلیاں سے اس کی اشاعت کی جا رہی ہے تاکہ کتاب ہندوستان میں بہ آسانی مل سکے۔

شمیم انہونوی

# مزاح نگاری

اور

# فرحت اللہ بیگ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"کسی زبان کے ادب میں طنز و مزاح کا وجود اس کے عروج کی ضمانت ہے کسی زبان میں اعلیٰ اور کامیاب ظرافت کی نمود اس وقت ہوتی ہے جب ایک طرف تو اس زبان کے بولنے والے تمدنی، ثقافتی اور ادبی اعتبار سے کسی قدر ترقی یافتہ دور میں پہنچ چکے ہوں اور دوسری طرف خود زبان بھی ارتقائی منازل پر گامزن ہو۔ گویا اخلاقی، روحانی، ادبی، فنی اور تمدنی اقدار کے متوازی ارتقا کے بغیر یہ گوہر گراں بہا ہاتھ نہیں آتا۔ قدیم اردو شاعری میں سوداؔ سے پہلے اور نثر میں غالبؔ سے قبل ظرافت کا سراغ نہیں ملتا۔ ادب، تمدن اور کلچر کی روایات ایک طرف اور انفرادی ذہانت تفکر اور تدبر دوسری طرف، ان کے باہمی میل جول اور عمل ورد عمل سے یہ چیز پیدا ہوتی ہے اور اس کے لئے بڑا وقت اور بڑا ریاض درکار ہے کیونکہ جس طرح ایک زبان کو اچھی ظرافت کے نمونوں سے مزین ہونے کے لئے بہت سے ادوار سے گذرنا پڑتا ہے اسی طرح ایک ظرافت نگار کو اچھی ظرافت کی تخلیق کے لئے عمر کے مختلف مدارج کے ساتھ ساتھ بہت سے دوسرے مدارج بھی طے کرنے پڑتے ہیں۔ وہ زندگی کے بلند و پست، تلخ و شیریں، خوب و زشت اور سرد و گرم کو

جھیلتا ہے اور حساس دل، بیدار دماغ اور متحمل طبیعت کے ساتھ حادثوں اور تہلکوں سے بظاہر متاثر نہ ہوتے ہوئے بباطن نہایت گہرا اور دیرپا اثر لیتا ہے۔ تغیرات اور انقلابات روزگار کو اپنے میں جذب کرتا ہے۔ غرضیکہ دل ودماغ اور طبیعت کے ایک مستقل ریاض کے بعد وہ اس قابل ہوتا ہے کہ دنیا کے کاروبار پر پورے علم ووثوق کے ساتھ ہنس سکے۔ یہ ہنسی اس کی دراصل فلسفیانہ ہوتی ہے اور اسی لئے اکثر اس کا دل محیط گریہ ہوتا ہے لیکن لب آشنائے خندہ ہی رہتے ہیں۔"

---

اردو نثر میں مزاح نگاری کی ابتدا دراصل اودھ پنچ سے ہوتی ہے مگر اودھ پنچ سے پہلے بھی ظرافت کے نمونے ملتے ہیں اور ان میں خطوط غالب سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ غالب ایک عظیم شاعر، بلندپایہ نثار اور بڑے ظریف انسان تھے۔ غالب کے خطوط میں ظرافت کی پاکیزہ اور صاف ستھری مثالیں وافر ملتی ہیں۔ غالب کے خطوط ۱۸۶۹ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئے اور اسی سال اردو کے پہلے ناول نگار نذیر احمد کی مرأۃ العروس بھی زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ نذیر احمد کا انداز بیان بھی ظرافت سے پر ہے اور ان کی ظرافت نہایت بلیغ ہے اور ان کے ایک ایک جملے سے آدھی گھنٹوں محظوظ ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مزاح نگاری ۱۸۷۷ء سے شروع ہوئی جب کہ منشی سجاد حسین نے اپنا مزاحیہ اخبار اودھ پنچ نکالا۔ انہوں نے ۳۶ برس تک، اپنے اس باغ وبہار اخبار کے ذریعہ لوگوں کو ہنسایا اور بہت سے اہم مزاح نگاروں سے ادب دوستوں کو روشناس کرایا جن میں رتن ناتھ سرشار

مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی جوالا پرشاد برق منشی احمد علی شوق، اکبر الہ آبادی اور مولوی احمد علی وغیرہ کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

اودھ پنچ کے رنگ کو فتنہ اور عطر فتنہ نے ہوا دی۔ ریاض کی شوخ طبیعت نے نظموں اور غزلوں کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی اپنا رنگ دکھایا۔ اودھ پنچ، فتنہ اور عطر فتنہ کے بعد جو دور شروع ہوتا ہے وہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس وقت ہندوستان میں نئی تہذیب کے قدم رفتہ رفتہ جم رہے تھے اور پرانی تہذیب اس سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہو رہی تھی اس لیے اس دور میں جن مزاح نگاروں کے نام آتے ہیں وہ قدیم اور جدید تہذیب کے درمیان کی کڑی ہیں اور اس دور کے مزاح نگاروں میں سید محفوظ علی بدایونی، مولانا ظفر علی خاں اور سلطان حیدر جوش بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ تینوں قدامت کے حامی اور نئی تہذیب کے زبردست مخالف ہیں اور چونکہ ان کا مشاہدہ ہمہ گیر ہے اس لئے نئی تہذیب میں جہاں بھی کوئی قابل گرفت بات ملتی ہے اس کے مضحک پہلو دکھانے سے یہ حضرات باز نہیں آتے۔

مزاح نگاری کا تیسرا دور جنگ عظیم کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس دور کو ہم موجودہ دور بھی کہہ سکتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، ملا رموزی، ایم اسلم، غلام احمد فرقت ابراہیم جلیس، کنھیا لعل کپور، اور شفیق الرحمٰن موجودہ دور کے اہم اور کامیاب مزاح نگاروں میں ہیں۔ ان میں غلام احمد فرقت کے ابراہیم جلیس، کنھیا لعل کپور اور شفیق الرحمٰن کے یہاں مزاح سے زیادہ طنز کا پہلو نمایاں ہے۔ چونکہ سب مجھے

اس مضمون میں صرف مرزا فرحت اللہ بیگؒ کے فن کا جائزہ لینا ہے اس لئے اس موقع پر دیگر مزاح نگاروں کے انداز تحریر پر روشنی ڈالنا ناگزیر نہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم محض مزاح نگار ہی نہیں تھے بلکہ بعض دوسری اہمیتوں کے بھی مالک تھے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انہوں نے اپنی دیگر مزاحیہ تحریروں کے علاوہ سیرت نگاری کے بھی چند اچھے نمونے چھوڑے ہیں۔ حالؔی نے اپنے تین معنوی بزرگوں کی سوانح عمریاں لکھیں اور بڑی کاوش سے لکھیں۔ حالؔی ایک بلند تصویر کے پیش نظر سیرت نگاری کی جدید تکنیک کی پیروی میں سیاسی تغیرات، تمدنی تحریکات، مذہبی مسائل اور کیفیات زمانہ کے ساتھ سیرت کے کارناموں کی پوری چھان بین کرتے ہیں اور اس کام میں تحریری قابلیت، اور فنی مہارت کے ساتھ ساتھ وسعت مطالعہ، علمیت اور ذوق تحقیق سبھی کچھ صرف کرتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں بڑے باعظمت کارنامے ہیں لیکن عظمت یا برگزیدگی چیزے دیگرے اور حسن و نفاست دیگر است۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی لکھی دو سوانح عمریوں میں عظمت نہیں ہے اور نہ شاید ہو سکتی تھی کیونکہ اس کے لئے اگر ایک طرف حالؔی جیسے ادیب، عالم اور مبصر کی ضرورت ہے تو دوسری طرف سعؔدی، غاؔلب اور سرسؔید جیسی شخصیتوں کا ہونا بھی لازمی ہے۔ لیکن فرحت اللہ کے پیش کردہ نذیر احمد اور سلیم پانی پتی کے مرقعوں میں ایک ایسا ادبی اور فنی حسن پایا جاتا ہے جس کو ہم عظمت کا بدل کہہ سکتے ہیں۔ فرحت اللہ نے سوانح نگاری کے فن میں ظرافت اور افسانہ نگاری کے دل پذیر انداز کو سمو کر اپنے کارناموں میں لطف و لطافت کا عنصر بہت زیادہ کر دیا ہے۔ وہ حالات و واقعات پر اتنی توجہ صرف نہیں

کرتے جتنی شخصی اوصاف اور کردار کی خصوصیات پر صرف کرتے ہیں۔

فرحت اللہ بیگ کی زبان دلی کی زبان ہے۔ جس کا بخوبی اندازہ "دلی کا یادگار مشاعرہ" اور "پھول والوں کی سیر" کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ لیکن فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد یا اُن کے دیگر پیرو مثلاً مولوی سید احمد، ناصر نذیر، فراق، راشد الخیری اور حسن نظامی وغیرہ کی طرح اعتدال سے بڑھ کر غلو یا نمائش سے کام لیتے نہیں معلوم ہوتے۔

مرزا فرحت اللہ کی ظرافت زبان اور انداز بیان کی ظرافت ہے واقعات کی ظرافت نہیں۔ وہ زبان کی چاشنی، اسلوب کی دل آویزی فقروں کی لطافت، اور الفاظ کی مخصوص ترتیب سے مزاح پیدا کرتے ہیں وہ کبھی مضحک واقعات کا سہارا نہیں لیتے۔ پھر ان کی ظرافت ہمیشہ ظرافت ہی رہتی ہے۔ طنز کی حدود کو کبھی نہیں چھوتی۔ اس میں کہیں تیزی، طراری، بے باکی یا تلخی نہیں ملتی۔ وہ اس قدر ہلکی پھلکی اور نرم و لطیف ہوتی ہے کہ بسا اوقات ہم اس کو خوش طبعی یا شگفتگی کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ ان کی ظرافت جہاں بھی ہے اور جتنی بھی ہے بالکل غیر شعوری چیز ہے کوشش، تصنع اور آورد کو اس میں مطلق دخل نہیں ہے۔ بے ساختگی اس کی نمایاں ترین خصوصیت ہے اور یہی اصل میں کامیاب ترین اور سب سے مکمل ظرافت کہی جا سکتی ہے کیونکہ اس کا سرچشمہ وہ ذہنی، تمدنی اور کلچری پختگی ہے جو صدیوں کی ریاضت اور ارتقاء کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

شمیم انہونوی۔ ایم۔ اے
لکچرار شعبۂ اردو
حلیم مسلم ڈگری کالج۔ کانپور

# ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری

اور

# کچھ ان کی زبانی

اللہ اللہ۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ میں اور دانی مولوی صاحب مرحوم کی باتیں سنتے تھے۔ ان کی ہمت ہماری ہمت بڑھاتی تھی۔ ان کا طرز بیان ہماری تحریر کا رہبر ہوتا تھا ان کی خوش مذاقی خود ان کو ہنساتی اور ہمارے پیٹ میں بل ڈالتی تھی۔ ان کی تکلیفیں خود ان کو پرتم اور ہم کو تڑپاتی تھیں، اور آج وہ دن ہے کہ ان کے حالات زبانِ قلم پر لانے سے ڈر لگتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ بزرگ ہستی "اخوت اسلامی" کا سبق پڑھے ہوئے تھی۔ اسکو اپنے بل بوتے پر ترقی کرنے پر ناز تھا، وہ چھوٹے درجہ سے بڑے درجہ پر ترقی کرنا اپنا کارنامہ سمجھتی تھی۔ اس نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر دکھایا، وہ کسی کی خوشامد، کسی کی سفارش یا خاندانی وجاہت کے باعث نہ تھا۔ وہ تھا اور دنیا کا وسیع اکھاڑا، وہ اپنے دستِ بازو کے بھروسہ پر اس میدان میں اترا، ہر مصیبت کا سامنا اپنی ذاتی قابلیت و ہمت سے کیا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کی تکمیل میں خون پانی ایک کر دیا۔ اور دنیا پر بخوبی ثابت کر دیا کہ بے یاری و مددگاری ترقی کی راہ میں ایسی رکاوٹیں نہیں ہیں۔ جو بآسانی ہٹائی نہ جا سکیں اور خاندانی تعلقات کی عدم موجودگی ایسی چیز نہیں ہے، جو مانع ترقی ہو سکے۔ جب کبھی جوش میں آتے تو ہمیشہ (I am a self made man) کا فقرہ ضرور استعمال کیا کرتے، اور جب کبھی اس پہلو پر نصیحت کرتے تو ہمیشہ یہی فرماتے کہ بیٹا جو کچھ کرنا ہے خود کرو، باپ دادا کی ہڈیوں کے واسطے سے بھیک نہ مانگتے پھرو۔

انسان فطرت سے مجبور ہے، جب دنیا کی نظریں اس پر پڑنے لگتی ہیں تو وہ ہمیشہ

اپنی پہلی حالت کی کمزوریوں کو چھپاتا اور خوبیوں کو دکھاتا ہے۔ جس طرح بڑے بڑے گھرانوں کی نا اہل اولاد اپنے باپ دادا کے نام سے اپنی نالائقی کو چھپاتی ہے۔ اسی طرح غریب گھرانوں کی لائق اولاد چاہتی ہے۔ کہ ان کے باپ دادا کے نام لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائیں یہ ہے ہماری اخلاقی کمزوری اور یہ ہے ہماری اسلامی سبق سے بے خبری، ایک مولوی نذیر احمد خاں تھے جو اپنے آباؤ اجداد کا نقشہ اصلی رنگ میں دکھاتے تھے۔ اور اس پر فخر کرتے تھے انکو اپنی ابتدائی غربت پر ناز تھا۔ اور اکثر کہا کرتے تھے۔ کہ میاں اگر لفٹنٹ گورنر کے بیٹے ہو تو کم سے کم ڈپٹی کمشنر تو ہو جاؤ، دس روپیہ کے اہلکار ہو کر باپ کو لفٹنٹ گورنر کہتے ہوے تمہیں شرم نہیں آتی۔

بہر حال یہ فطرت انسانی کا خیال تھا۔ جس نے اب تک مجھے مولوی صاحب مرحوم کے حالات لکھنے سے روکا، بہت کچھ لکھ لیا تھا، وہ پھاڑ ڈالا۔ کہ کہیں اینچ پینچ چھوڑ گھسیٹن میں نہ پڑ جاؤں، رہ رہ کر جوش آتا تھا اور ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ خدا بھلا کرے مولوی عبد الحق صاحب کا کہ انہوں نے مجھے اس اگر مگر سے نکالا، اور دل کی باتوں کو حوالہ قلم کرانے پر آمادہ کر دیا۔ اب جو کچھ کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا خواہ کوئی برا مانے یا بھلا، جہاں مولوی صاحب مرحوم کی خوبیاں دکھاؤں گا وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کر دوں گا تا کہ اس مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویر کھنچ جائے، اور یہ چند صفحات ایسی سوانح عمری نہ بن جائیں جو کسی کے خوش کرنے یا جلانے کو لکھی گئی ہو، ہیں واقعات کے بیان کرنے میں کوئی سلسلہ بھی قائم نہ کروں گا۔ کیونکہ یہ بناوٹ کی صورت ہے، جس موقع پر جو کچھ سنا یا دیکھا اس کو جوں کا توں لکھ دوں گا، اور ہمیشہ اس امر کی کوشش کرونگا کہ جہانتک ممکن ہو واقعات مولوی صاحب ہی کی زبان میں بیان کئے جائیں انشاءاللہ واقعات کے اظہار میں مجھ سے غلطی نہ ہو گی، ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض نام بھول جانے کی وجہ سے چھوڑ جاؤں یا غلط لکھ جاؤں اب رہا سچ یا جھوٹ تو اس کی مجھے پروا نہیں ہیں اپنے محترم استاد کے حالات

لکھ رہا ہوں، اگر سچ ہیں تو میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ اگر جھوٹ ہیں تو وہ خود میدان حشر میں سود در سود لگا کر تاوان وصول کر لیں گے۔

اب طرز بیان تو میں اس میں متانت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہوں کیونکہ مولوی صاحب جیسے خوش مذاق آدمی کے حالات لکھنے میں متانت کو دخل دینا ان کا منھ چڑانا ہی نہیں ان کی توہین کرنا ہے بلکہ یوں کہو کہ سید انشا کو میر اور مارک ٹوئین کو امرسن بنانا ہے۔ جب اپنی زندگی ہی میں انھوں نے میری شوخ چشمی کی ہنس ہنس کر داد دی تو کوئی وجہ نہیں کہ اب وہ اپنی وضعداری کو بدل دیں اور میری صاف گوئی کو گستاخی قرار دے کر دعویدار ہوں۔

# چل رے خامہ بسم اللہ

سنہ ۱۹۳۰ء میں میاں دانی نے اور میں نے ہندو کالج دہلی سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا اور دونوں مشن کالج میں داخل ہو گئے، ایف۔ اے میں میرا مضمون اختیاری سائنس اور دانی کا عربی تھا، انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ بی۔ اے میں عربی لے لو۔ دونوں کو ایک دوسرے سے مدد ملے گی، اور امتحان کی تیاری میں سہولت ہو گی، مجھے اپنے حافظہ پر گھمنڈ تھا یہ بھی نہ سمجھا کہ اس مضمون کو سنبھال سکوں گا یا نہیں، جھٹ راضی ہو گیا۔ القصہ ہم دونوں بی۔ اے کے درجہ ابتدائی میں شریک ہو گئے، ہمارے عربی کے پروفیسر مولوی جمیل الرحمٰن صاحب تھے، بڑے اللہ والے لوگ تھے، عربی کا گھنٹہ یا سائی تصوف کی باتوں میں گذر جاتا تھا۔ کچھ تھوڑا بہت پڑھ بھی لیتے تھے۔ دانی کچھ سمجھتے ہوں تو سمجھتے ہوں، کمترین تو طوطے کی طرح حفظ کر لیتا تھا۔ اب وہی صرف و نحو اس میں تو کورے کا کورا ہی رہا سنتے آئے ہیں کہ "دو مصیبت کہہ کر نہیں آتی"، لیکن یہ نہیں سنا تھا کہ "عربی کے پروفیسر کہہ کر نہیں جاتے" ایک دن جو مولوی صاحب کے کمرے میں ہم دونوں پہنچے تو دیکھا کہ کمرہ خالی ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کل شام کو استعفا دے کر کعبۃ اللہ چل دیئے پرنسپل صاحب کے پاس

پہنچے، ان سے پوچھا کہ دوسرے صاحب کب آتے ہیں، تو انہوں نے کورا جواب دیدیا کہ ہم عربی کی جماعت کا بندوبست نہیں کر سکتے، بہتر یہ ہے کہ مضمون تبدیل کر لو، میں نے دانی سے کہا کہ بھئی تمہارے کہنے سے میں نے عربی لی تھی۔ اب میرے کہنے سے تم سائنس لے لو جس سہولت کی بناء پر تم نے میرا مضمون بدلوایا تھا۔ اب اسی سہولت کے مدنظر اپنا مضمون بدلو، بقول شخصے کہ "مرتا کیا نہ کرتا" وہ راضی ہو گئے دفتر میں جا کر جو لکچروں کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ مضمون تبدیل کرنے کا وقت نہیں رہا۔ لکچر کم رہ جائیں گے اور اس طرح بجائے دو سال کے تین سال میں شریک امتحان ہونا پڑے گا "سنگ آمد و سخت آمد" جب "جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔" کی صورت آ پڑی تو دوسرے ٹھکانے کی تلاش ہوئی، دونوں سر ملا کر بیٹھے مشورہ کئے، ریزولیوشن پاس ہوئے، آخر یہ تجویز پاس ہوئی کہ "خاک از تودہ کلاں بردار" کے مقولے پر عمل کر کے کسی زبردست مولوی کو گھیرنا چاہیئے، دلی میں دو تین بڑے عربی داں مانے جاتے تھے۔ ایک مولوی محمد اسحٰق دوسرے شمس العلماء مولوی ضیاءالدین خاں صاحب ایل۔ ایل ڈی، اور تیسرے مولوی نذیر احمد خاں صاحب، پہلے کو تو دیوانگی سے فرصت نہ تھی۔ اس لئے وہاں تو دال گلتی معلوم نہیں ہوئی، قرعہ دوسرے صاحب کے نام پر پڑا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا مولوی ضیاءالدین صاحب جامع مسجد میں رات کے دس گیارہ بجے تک بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے تھے، ہم دونوں نے بھی جا کر شام ہی سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ڈیرے ڈال دیئے، آٹھ بجے، نو بجے، دس بج گئے مولوی صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل، خدا خدا کر کے دروازے سے قندیل نکلتی ہوئی معلوم ہوئی، ہم دونوں بھی ہاتھ پاؤں جھٹک خوشامد کے فقرے سوچ کھڑے ہو گئے، ہم آخری سیڑھیوں پہ کھڑے تھے، اس لئے دروازے میں سے پہلے قندیل نکلتی نظر آئی، اس کے بعد جس طرح سمندر کے کنارے سے جہاز آتا دکھائی دیتا ہے اسی طرح پہلے مولوی صاحب کا

عمامہ، اس کے بعد ان کا نورانی چہرہ سرمگیں آنکھیں، سفید ریش مبارک سفید جبّہ اور سب سے آخر زرد بانات کی سلیم شاہی جوتیاں نظر آئیں، آہستہ آہستہ انھوں نے سیڑھیوں سے اترنا اور اوپر تلے ہمارے سانس نے چڑھنا شروع کیا، ہم سوچتے ہی رہے کہ راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں وہ سٹ سے پاس سے نکل گئے۔ آخر ذرا تیز قدم چل کر ان کو جا لیا اور نہایت ادب سے دونوں نے جھک کر فراشی سلام کیا۔ وہ سمجھے کوئی راہگیر ہیں میری وجاہت کی وجہ سے سلام کر رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھے کہ سائل ہیں۔ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ وہ تو سلام لیتے ہوئے آگے بڑھے اور ہم نے وہی پہلے والی ترکیب کی۔ کہ چکر کھا کر پھر سامنے آگئے۔ یہ دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکے پوچھا، میں نے آپ صاحبوں کو نہیں پہچانا، کیا مجھ سے کوئی کام ہے، ہم رام کہانی بیان کر کے عرض مدعا زبان پر لائے فرمانے لگے۔ "تم کو معلوم ہے کہ میں پنجاب یونیورسٹی کا ممتحن ہوں۔" بجنسہ اسی لہجے میں یہ الفاظ ادا کیے جیسے اس زمانہ میں کوئی کہے "تم کو معلوم ہے کہ میں سی۔ آئی۔ ڈی کا انسپکٹر ہوں۔" لیکن ہم جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے، عرض کیا کہ ہم امتحان میں رعایت کے طالب نہیں تعلیم میں مدد چاہتے ہیں، فرمانے لگے کہ "تم کو تعلیم دینا اور پھر ممتحن رہنا میرے ایمان کے خلاف ہے، کسی دوسرے کی تلاش کیجیے" ممکن ہے کہ یہ مسئلہ کوئی جزو ایمان ہو ممکن ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے مولوی صاحب سے تعلیم نہ دینے کا حلف لے لیا ہو۔ بہرحال کچھ بھی ہو، انھوں نے ہم دونوں کو سلام علیکم کا ایک زور سے دھکا دے کر نوکر کو حکم دیا کہ آگے بڑھو، وہ حکم کا بندہ قندیل اٹھا آگے چلا اور مولوی صاحب اس کے پیچھے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے روانہ ہوئے، ڈر تھا کہ کہیں یہ دونوں قطاع الطریق پھر راستہ نہ روک لیں۔ مگر مولوی صاحب کے طرز عمل اور سلام علیکم کے جھٹکے نے ہم دونوں کو مضمحل کر دیا تھا، جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور مولوی صاحب رہٹ کے کنوئیں کی گلی میں گھس اپنے مکان میں داخل ہو گئے، چلو امید نمبر ۲ پر پانی پھر گیا، لیکن آئندہ کے لیے سبق

مل گیا کہ ایسے زبردست دشمن پر کھلے میدان میں حملہ کرنا خطرناک ہے، ایسے رستم کو پچھاڑنے کے لیے شغاد بننا ضرور ہے وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کونسل ہوئی اور ریزولیوشن پاس ہوا کہ مولوی نذیر احمد صاحب پر حملہ عبدالرحمٰن کی آڑ میں کیا جائے۔ اب میاں عبدالرحمٰن صاحب کا حال بھی سن لیجیئے، ان کے والد کا نام سراج الدین صاحب تھا نہایت نیک اور پرہیزگار شخص تھے۔ جوتوں کی دوکان تھی، مولوی نذیر احمد صاحب اس دوکان کو ہمیشہ رقمی مدد دیا کرتے تھے اور روزانہ شام کو وہاں آکر بیٹھتے تھے، عبدالرحمٰن میرے ہم جماعت تھے۔ لیکن آپس میں میل جول بہت تھا، مولوی صاحب کو ان کی تعلیم کا بہت خیال تھا۔ چنانچہ ان ہی کی وجہ سے عبدالرحمٰن نے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات پاس کئے۔ ان ہی کی وجہ سے وکالت میں ترقی کی، یہاں تک کہ مولوی صاحب ہی کی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ کہ اس وقت دہلی میں ان کی ٹکر کا کوئی مسلمان وکیل نہیں ہے، اس زمانے میں یہ ایف۔ اے میں پڑھتے تھے۔

بہرحال اسکیم تیار ہو گئی، اور دوسرے ہی دن سے میں نے عبدالرحمٰن کو گانٹھنا شروع کیا۔ وہ ایک روز کے بعد ان سے اظہار مطلب کیا کہنے لگے کہ "بھئی مولوی صاحب کو فرصت کم ہے کہیں انکار نہ کر بیٹھیں" میں نے کہا کہ "میاں عبدالرحمٰن تم ان تک ہم کو پہنچا دو اگر ہو سکے تو ایک دو کلمہ خیر بھی ہمارے حق میں کہہ دو، آگے ہم جانیں اور ہماری قسمت" وہ راضی ہو گئے اور کہا "شام کو آٹھ بجے دوکان پر آجانا میں مولوی صاحب سے ملوا دوں گا" اندھا کیا چاہے.....؟ دو آنکھیں، ٹھیک آٹھ بجے ہم دونوں سراج الدین صاحب کی دوکان پر پہنچے، یہ دوکان فتحپوری کی مسجد کے قریب تھی۔ جا کر کیا دیکھتے ہیں مولوی صاحب بیٹھے سراج الدین سے کچھ رقم کا حساب کر رہے ہیں، ہم نے جاتے ہی فراشی سلام کئے اور خاموش تخت کے کونے پر بیٹھ گئے، سراج الدین صاحب نے خیریت پوچھی، عبدالرحمٰن ہمارے پاس آ بیٹھے۔ مگر مولوی صاحب روپیوں کے حساب کتاب میں اس قدر مشغول

تھے کہ انھوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون آیا، کون گیا، میں نے سوچا کہ یہاں بھی معاملہ پلٹتا معلوم نہیں ہوتا، وقفکار سن کر یہاں سے بھی نکلنا پڑے گا، سچ ہے مایوسی انسان کو ہمت والا بنا دیتی ہے۔ "مرتا کیا نہ کرتا" میں نے بھی سوچ لیا کہ آج اس پار یا اس پار۔ مولوی ضیاء الدین صاحب تو بچ کر نکل گئے، لیکن مولوی نذیر احمد صاحب سے دو دو ہاتھ ہو جائیں گے، قصہ مختصر مولوی صاحب حساب سے فارغ ہوئے اور پوچھا کہ یہ دونوں صاحب کون ہیں، عبدالرحمٰن نے ہمارے نام بتائے، کچھ الٹے سیدھے خاندانی حالات بھی بیان کئے اس کے بعد ہماری مصیبت کا بھی ذرا سا تذکرہ کیا اور خاموش ہو گئے۔ میں نے دل میں کہا "پرائے برتے کھیلا جوا، آج نہ ہوا کل ہوا۔"

اب میاں عبدالرحمٰن کو رہنے دو جو کچھ کہنا ہے خود کہہ ڈالو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں سے بھی بے نیل و مرام باضابطہ پسپائی ہو، میں نے نہایت رقت آمیز لہجہ میں اپنی مصیبت کا تذکرہ شروع کیا، فرمانے لگے۔ "تو عربی چھوڑ دو سائنس پڑھو، بیٹا آج مسلمانوں کو سائنس کی بڑی ضرورت ہے، ہمارے ہاں مثل ہے، "پڑھیں فارسی بیچیں تیل" یہ دیکھو قدرت کے کھیل، فارسی پڑھ کر تیل تو بیچ لو گے، عربی پڑھ کر تیل بھی بیچنا نہ آئے گا۔" ان کی اس پر مذاق گفتگو سے ہم دونوں کے دل بڑھ گئے ہم رہنے والے ٹھیرے جامع مسجد کے نیچے، بھلا ایسی باتوں میں ہم سے کون عہدہ برآ ہو سکتا ہے ہم نے بھی ایسے ہی شگفتہ الفاظ میں جواب دیا، مولوی صاحب پہلے تو مسکراتے رہے۔ اس کے بعد کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ دانی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ "یہ بڑا غریب معلوم ہوتا ہے مگر تو بڑا بدمعاش ہے، بیٹا جاؤ کسی دوسرے مولوی صاحب کی تلاش کرو، دلی میں کیا مولویوں کا کال ہے، مجھے ذرا بھی فرصت ہوتی۔ تو کبھی انکار نہ کرتا، میں نے عرض کی کہ "جناب والا کا ارشاد بالکل صحیح ہے مگر جو مولوی ہیں وہ پڑھاتے نہیں اور جو پڑھاتے ہیں وہ مولوی نہیں۔" کہنے لگے۔ "نہیں ایک آدھ ایسا بھی نکل آئے گا جو

مولوی بھی ہوگا اور پڑھائے گا بھی جناب شمس العلماء مولوی ضیاءالدین صاحب
ایل۔ ایل۔ ڈی (یہ الفاظ بہت طنز سے کہے) کے پاس جاؤ، ان کو فرصت بھی ہے اور
عالم بھی ہیں۔" میں نے کہا "اس کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن بھی ہیں۔" کہنے لگے
میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔" یہاں تو جلے بیٹھے ہی تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں والا
واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا، بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ "بھئی تم لونڈوں سے
ڈرنا چاہیئے۔ ضیاءالدین کو اگر خبر ہو جائے کہ ان کے اوصاف حمیدہ و خصائل پسندیدہ
سراج الدین کی دوکان پر اس طرح معرض بحث میں آتے ہیں۔ تو یقین جانو کہ نالش
ٹھونک دیں، اچھا کبھی میں تم کو پڑھاؤں گا۔ مگر تم بھاگ جاؤ گے۔ ہم دونوں کے منھ
سے ایک ساتھ نکلا۔ "نہیں ہرگز نہیں۔" مولوی صاحب نے کہا کہ "چھٹی ایک دن کی
نہ ہوگی۔" ہم نے کہا "بہت خوب۔" مولوی صاحب نے کہا "عید بقرعید کو بھی آنا پڑے گا"
ہم نے کہا بہت مناسب، کل کس وقت حاضر ہوں' مولوی صاحب تھوڑی دیر تک
انگلیوں پر کچھ اپنے وقت کا حساب کرتے رہے، اس کے بعد کہا۔ "دوپہر کو ڈیڑھ بجے۔"
ہم نے کہا "بہت خوب"۔ چونکہ ان باتوں میں رات زیادہ ہوگئی تھی۔ اس لئے مولوی صا[حب]
دوکان سے اٹھے، ہم سب نے سلام کیا اور وہ وعلیکم سلام کہتے ہوئے تشریف لے گئے
یہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ سراج الدین صاحب نے وقتاً فوقتاً ہماری ہاں میں ہاں ملا کر
اس فیصلے میں بڑی مدد کی، ہم دونوں بھی خوش اٹھے اور سلام علیکم وعلیکم السلام
کرکے دوکان سے چلے۔ راستہ میں دانی نے کہا۔ "میاں مرزا بڑے میاں نے مار ڈالا۔"
گیارہ بجے کالج سے پڑھ کر نکلیں گے، کشمیری دروازے سے چل کر چوڑی والوں آتے
آتے ساڑھے گیارہ بج جائیں گے، دم نہ لینے پائیں گے کہ مولوی صاحب کے ہاں چلنے
کی تیاری کرنی پڑے گی، کہاں چاوڑی اور کہاں کھاری باؤلی، جون کا مہینہ کہیں
راستہ میں لو لگ کر ٹیں نہ ہو جائیں۔" میں نے کہا۔ "میاں دانی کچھ دنوں چل کر دیکھو شاید

مولوی صاحب کو رحم آجائے مگر ان کو آخر تک رحم نہ آیا۔ لطف یہ ہے کہ جاڑوں میں صبح ساڑھے چھ بجے ہی سے تعلیم کا وقت مقرر ہوا۔ لیکن ایمان کی بات ہے کہ مولوی صاحب کی ہمت تھی کہ وہ ہمارے پڑھانے کو تیار ہو گئے، بیچاروں کا ایک منٹ خالی نہ تھا اور انھوں نے جو وقت ہم کو دیا تھا وہ اپنے آرام کے وقت میں سے کاٹ کر دیا تھا، تقریباً دو برس تک ہم ان سے پڑھتے رہے نہ ہم نے کبھی گرمی یا سردی کی شکایت کی اور نہ کبھی وقت بدلنے کا لفظ زبان پر لائے۔ نہ ان دو سال میں ایک دن ناغہ کیا، یہاں تک کہ مولوی صاحب بھی ہمیشہ کہتے تھے کہ "بیٹا جب تم دونوں آتے ہو میرا دل خوش ہو جاتا ہے۔ کیونکہ میں تم میں طالب علمی کی بو پاتا ہوں، میں جانتا ہوں کہ تعلیم کس کو کہتے ہیں اور علم کیونکر حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح ہم نے پڑھا ہے کچھ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ اس زمانے کے لونڈوں پر اگر ایسی بپتا پڑے تو گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں (مگر میری طرف دیکھ کر) استاد تم سے مجھے کچھ توقع نہیں، تم صرف بی۔ اے پاس کرنے کی فکر میں ہو، دانی کو شوق ہے یہ عربی میں ترقی کرے گا، مگر تم کورے کے کورے ہی رہو گے اور انشاءاللہ پانچ برس میں میری ساری محنت اکارت کر دو گے۔" خدا کے فضل سے ان کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

اس سے پہلے کہ میں مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم کا ذکر کروں اس میں مولوی صاحب کی شکل و صورت، مکان کی حالت، ان کے رہنے سہنے کے طریقے اور ان کے مشاغل کا نقشہ کھینچ دینا مناسب خیال کرتا ہوں تاکہ مولوی صاحب کے کیرکٹر کا صحیح اندازہ ہو سکے لیکن سینو ٹیوگراف کا یہ قلم چڑھانے سے قبل میں اپنے طرز بیان کے متعلق معافی مانگ لیتا ہوں، کیونکہ میری شوخی بعض جگہ حد تجاوز سے بڑھ جائے گی، لیکن آپ تمام قارئین کرام کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانح عمری لکھتے تو اسی رنگ میں لکھتے اور اگر آپ ان کی صحبت میں رہے ہوتے تو آپ کو بھی ان کے حالات لکھتے وقت

میری ہی طرح معافی مانگنی پڑتی ورنہ آپ کی تحریر بجائے مولوی نذیر احمد صاحب کی سوانحعمری کے کسی ٹھیٹھ ملا کے بے لطف واقعات کا ایک مجموعہ ہو جاتی، خدا بہتر جانتا ہے کہ اس وقت بھی لکھتے لکھتے پنسل ہاتھ سے رکھ دیتا ہوں اور ایک عالم بے خودی مجھ پر چھا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کی کوئی بات نہ تھی۔ جس میں خوش مذاقی کا پہلو نہ ہو، کوئی قصہ نہ تھا۔ جس میں ظرافت کوٹ کوٹ کر نہ بھری ہو، کوئی طرز بیان نہ تھا ہنساتے ہنساتے نہ لٹا دے وہ دوسروں کو ہنساتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے اپنی باتوں سے ان کو ہنسائیں یہی وجہ تھی کہ (ہم اور خاص کر میں) مولوی صاحب کے سامنے بہت شوخ ہو گئے تھے لیکن وہ طرح ہی نہیں دیتے تھے۔ بلکہ کہا کرتے تھے۔ کہ مجھے مقطع اور مسمسے شاگردوں سے نفرت ہے، اس کے بعد بھی اگر کوئی صاحب یہ توقع رکھیں کہ میں مولوی صاحب کے حالات متانت کا پہلو اختیار کر کے لکھوں تو میں اس کا صرف یہی جواب دوں گا کہ ع

ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

لیجئے اب مولوی صاحب کا حلیہ سنیئے:۔

رنگ سانولا مگر روکھا۔ قد خاصا اونچا تھا۔ مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا دہرا بدن گدرا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل، فرماتے تھے کہ بچپن میں ورزش کا شوق تھا، ورزش چھوڑ دینے سے بدن مُرمُروں کا کھیلا ہو جاتا ہے، بس یہی کیفیت تھی، بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد ٹھنگنا معلوم ہونے لگا تھا اس کا تکملہ اونچی ترکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا، کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا، توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازاربند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں بلکہ تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا، اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں تہمد (تہ بند) باندھتے تھے، اس کے پلو اُڑسنے کے بجائے ادھر اُدھر ڈال لیتے تھے مگر اٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے

اول تو قطب بنے بیٹھے رہتے تھے اگر اٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کر لیتے تھے کہ فی الحال اٹھنے کو ملتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں، ضرورت نے بہت مجبور کیا تو ازار بند کی گرہ یا تہمد کے کونوں کے اڑسنے کا دباؤ توند پر ڈالتے تھے۔ سر بہت بڑا تھا مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا، جو تھوڑے رہے سہے بال تھے وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دیئے جاتے تھے، ورنہ بالوں کی یہ کگر سفید بقش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہو جاتی تھی، آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، بھویں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ افگن تھیں۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ وہ چمک نہیں جو غصہ کے وقت نمودار ہوتی ہے بلکہ یہ وہ چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اگر میں ان کو "مسکراتی ہوئی آنکھیں" کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ کلہ جبڑا زبردست پایا تھا چونکہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے محیط نے سانس کے لئے گنجائش بڑھا دی تھی، اس لئے نہایت اونچی آواز میں بغیر سانس کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے، آواز میں گرج تھی مگر لوچ کے ساتھ، کوئی زور سے سنے تو یہ سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں۔ لیکن پاس بیٹھنے والا ہنسی کے مارے لوٹ رہا ہو، جوش میں آکر جب آواز بلند کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ترم بج رہا ہے اسی لئے بڑے بڑے جلسوں پر چھا جاتے تھے، اور پاس اور دور بیٹھنے والے دونوں کو ایک ایک حرف صاف صاف سنائی دیتا تھا، ناک کسی قدر چھوٹی تھی، اور نتھنے بھاری، ایسی ناک کو گنواروں کی اصطلاح میں گاجر اور دلی والوں کی بول چال میں "پھلکی" کہا جاتا ہے، گو متانت چھو کر نہیں گئی تھی لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار میں خود بخود متانت پیدا کر دی تھی، داڑھی بہت چھدری تھی۔ ایک ایک بال باآسانی گنا جا سکتا تھا، کلے تو کبھی قینچی کے منت کش نہیں ہوئے، البتہ ٹھوڑی پر کا حصہ کبھی کبھی ہموار کر لیا جاتا تھا، داڑھی کی وضع قدرت نے خود فرنچ فیشن

بنادی تھی۔ بالوں میں سے ٹھوڑی اس طرح دکھائی دیتی تھی، جیسے اکس ریز (X Rays) ڈالنے سے کسی بکس کے اندر کی چیز، ٹھوڑی چوڑی اور ان کے ارادے کے پکے ہونے کا اظہار کرتی تھی، گردن چھوٹی مگر موٹی تھی، لیجئے یہ ہیں مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔

اب رہی لباس کی بحث تو اس کا بھی حال سن لیجئے، جنھوں نے اسٹیج پر ان کو شالی رومال باندھے، کشمیری جبہ، یا ایل۔ ایل۔ ڈی کا گون پہنے دیکھا ہے۔ انھوں نے عالی جناب شمس العلماء مولوی، حافظ ڈاکٹر نذیر احمد خاں صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی مدظلہ العالی کو دیکھا ہے، مولوی نذیر احمد صاحب کو نہیں دیکھا، ان کے گھر کے اور باہر کے لباس میں زمین آسمان کا فرق تھا، اگر ان کو روزانہ باہر نکلنے کا شوق نہ ہوتا تو لباس کی حد ہی ان کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی، جب شام کو گھر سے نکلتے تو ممو ماتر کی ٹوپی یا چھوٹا سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے، گرمیوں میں نہایت صاف شفاف سفید اچکن اور سفید کرتہ پجامہ ہوتا، اور جاڑوں میں کشمیرے کی اچکن یا کشمیری کام کا جبہ چونکہ سراج الدین صاحب سے لین دین تھا۔ اس لئے لال ترکی کا سلیم شاہی جوتا زیادہ استعمال کرتے تھے پھر بھی وقت بے وقت کے لئے دو انگریزی جوڑے لگا رکھے تھے۔ جن پر میری یاد میں پالش ہونے کی کبھی نوبت نہ آئی، یہاں تک کہ دونوں سوکھ کر کھڑنک ہو گئے تھے، انھی کا پاؤں تھا کہ ان چینیوں کے سے سخت جوتوں کی برداشت کرتا تھا۔ جرابوں سے ہمیشہ نفرت تھی گو دربار میں جانے کے لئے دو ایک جوڑیاں پاس رہتی تھیں، یہ تو پبلک کے مولوی صاحب ہوئے۔

اب ہمارے مولوی صاحب کو دیکھئے، آیئے میرے ساتھ چوڑی والوں سے چلیئے چوڑی والوں سے نکل کر چوڑی میں آیئے۔ الٹے ہاتھ کو مڑ کر قاضی کے حوض پر

سے ہوتے ہوئے سرکی والوں سے گذر کر لال کنوئیں پہنچے۔ آگے بڑھے توبڑیوں کا کڑہ ہے وہاں سے آگے چل کر نئے بانس میں آئیے یہ سیدھا راستہ کھاری باؤلی کو نکل گیا ہے بکڑہ سے ذرا ادھر ہی دائیں ہاتھ کو ایک گلی مڑی ہے، یہ بتاشے والوں کی گلی ہے، بتاشے بنتے ہوئے ہم نے سب سے پہلے یہیں دیکھے یہاں اچار چٹنیوں والوں کی بیسیوں دکانیں ہیں، انہی دوکانوں کے بیچ میں سے ایک گلی سیدھے ہاتھ کو مڑی ہے تھوڑی ہی دور جا کر بائیں طرف ایک تپلی سی گلی اس میں سے کٹ گئی ہے اسی گلی میں پہلا ہی مکان مولوی صاحب کا ہے۔ مکان دو منزلہ ہے اور نیا بنا ہوا ہے صفائی کی یہ حالت ہے کہ تنکا پڑا نظر نہیں آتا، دروازے کے باہر دونوں پہلوؤں میں دو سنگین چوکیاں ہیں، دروازے کو عبور کرنے کے بعد صحن میں آتے ہیں، صحن کسی قدر چھوٹا ہے، سیدھی طرف دفتر ہے جہاں اکثر دو تین آدمی بیٹھے کلام مجید پڑھا کیا کرتے ہیں اسکے مقابل بائیں طرف باورچی خانہ ہے، چولہے بنے ہوئے ہیں، آگ جل رہی ہے مگر برتن اور ہنڈیاں وغیرہ جو باورچی خانہ کا جز و لاینفک ہیں سرے سے ندارد ہیں، آگ صرف حقہ کے لئے سلگائی جاتی ہے، کھانا دوسرے گھر سے پک کر آتا ہے، دروازے کے بالکل سامنے اکہرا دالان ہے، اور اندر ایک لمبا کمرہ گرمی کا موسم ہے اور مولوی صاحب ایک چھوٹی سی میز کے سامنے کچھ لکھ رہے ہیں کمرے کے دروازے بند ہیں ایک کھلا ہے، باہر ایک بڑھیا پھونس چماری بیٹھی پنکھے کی رسی کھینچ رہی ہے، ہاں تو میں ایک تصویر دکھانا چاہتا تھا؟ مولوی صاحب کا لباس، مگر خدا کے فضل سے ان کے جسم پر کوئی لباس ہی نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے۔ نہ کرتا ہے نہ ٹوپی نہ پیجامہ، ایک چھوٹی سی تہمد برائے نام کمر سے بندھی ہوتی نہیں، محض لپٹی ہوئی ہے، لیکن گرہ کے جنجال سے بے نیاز ہے، کمرے میں نہایت اعلیٰ چاندنی کا فرش ہے۔ ایک پلنگ بچھا ہوا ہے، کبھی اس پر چادر بے کبھی نہیں ہے، سرہانے تکیہ رکھا ہے مگر اسکی رنگت کا بیان احاطہ تحریر سے باہر ہے، البتہ جس گاؤ تکیہ سے مولوی صاحب لگے بیٹھے ہیں وہ بہت

صاف ہے تالین بھی عمدہ اور قیمتی ہے، اگر مولوی صاحب کی حالت دیکھ کر آپ سوال کر بیٹھیں کہ "مولانا" ایں چہ کار ست کردہ "تو انشاء اللہ یہی جواب ملے گا کہ محتسب را درون خانہ چہ کار" جاڑوں میں مکان کے اوپر حصہ میں رہتے تھے، چلئے وہاں کا رنگ بھی دکھادوں صدر دروازے سے ملا ہوا زینہ ہے اور سیڑھیوں کے ختم ہونے پر غسلخانہ اور بیت الخلاء ہے" اس کے بعد ایک دروازہ آتا ہے دروازے سے گذر کے چھت پر آتے ہی سامنے ہی ایک کمرہ ہے، اور اس کے دونوں جانب کوٹھریاں، غسلخانہ کے بالکل مقابل، دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ آخر میں مولوی صاحب یہیں رہا کرتے تھے، جس زمانے میں ہم پڑھتے تھے تو ان کی نشست سامنے والے بڑے کمرے میں تھی، یہاں بھی چاندنی کا فرش ہے اس پر قالین، پیچھے گاؤ تکیہ سامنے ایک چھوٹی نیچی میز، پہلو میں حقہ، اسکی حقیقت کا حقہ بیان کرنا مشکل ہے، مولوی صاحب کو حقہ کا بہت شوق تھا۔ مگر تمباکو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ اس کے دھوئیں کی کڑواہٹ بیٹھنے والوں کی حلق میں پھندا ڈال دیتی تھی، فرش قیمتی تھا۔ مگر چلم پیسے کی دو دو والی اور نیچہ تو خدا کی پناہ، اسکے تیار ہونے کی تاریخ لوگوں کے دلوں سے مدت کی محو ہو چکی تھی، ایک دفعہ ایک صاحب نے نیچہ بدلنے کا ارادہ بھی کیا۔ مگر مولوی صاحب نے نیچے کو جورو کا مترادف قرار دیکر ایسا سخت فقرہ کسا کہ بیچارے ٹھنڈے ہو کر رہ گئے خیر جاڑے کا موسم ہے مولوی صاحب بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور پڑھا رہے ہیں، سر پر کنٹوپ ہے، مگر بڑا دقیانوسی کبھی کانوں کو ڈھکے ہوئے اور ڈوریاں نیچے لٹکتی ہوئیں کبھی اسکے دونوں پاکھے اوپر کی طرف سیدھے کھڑے ہو کر لاٹ پادری کا نمونہ بن جاتے اور ڈوریاں طرے کا کام دیتیں، کبھی پاکھوں کو سر پر اوپر تلے ڈوریوں سے کس دیا جاتا اور اس طرح کنٹوپ فلیٹ کیپ کی شکل اختیار کر لیتا، جسم پر روئی کی مرزئی مگر ایسی پرانی کہ اس کی روئی کی گرمی مدت سے مائل بہ سردی ہو چکی ہے اوپر صندلی رنگ کا دھسہ پڑا ہوا یعنی

دیکھا آپ نے ہمارے مولوی صاحب کو؟ چار بجے اور مولوی صاحب نے آواز دی پانی تیار ہے؟ جواب ملا "جی ہاں" مولوی صاحب غسلخانہ میں گئے کپڑے بدل یا یوں کہو کہ جون بدل، باہر نکل آئے اور چلے ٹون ہال کو لیجئے اب یہ ہمارے مولوی صاحب نہیں رہے، آپ کے مولوی صاحب ہو گئے۔

گھر میں اس لباس سے استغنا کے کئی باعث تھے، اول تو یہ بات تھی کہ ان کو اپنے کاموں ہی سے فرصت نہ تھی، پڑھتے پڑھاتے اور لکھنے لکھانے میں ان کا سارا دن گذر جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ بہت کم لوگوں سے مکان پر ملتے تھے، جس کو ملنا ہوتا تھا شام کو ٹاؤن ہال کی لائبریری میں جا کر ان سے مل آتا تھا، جو لوگ مکان پر آتے تھے وہ یا تو ان کے شاگرد ہوتے تھے یا خود صاحب کمال، اور ظاہر ہے کہ ایسے صاحب کمال لوگ ظاہری حالت کو نہیں دیکھتے، یہ دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب ہیں کتنے پانی میں لباس ہے۔ حسن بے اعتنائی کی تیسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے۔ کسی دوسرے کا دولت خانہ نہیں جانتے تھے، ان کو جس طرح آرام ملتا اسی طرح رہتے، جی چاہا پہنتے، نہ جی چاہتا نہ پہنتے، البتہ جب باہر جاتے تو "کھائے من بھاتا پہنئے جگ بھاتا"، پر عمل کرتے۔ اصلی عالم تو گھر پر تھے، باہر نکل کر ظاہری عالم بھی بن جاتے سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گھر میں کوئی عورت نہ تھی جو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی یا کم سے کم انکا کنٹوپ، مرزئی یا سرہانے کے تکیہ کا غلاف تو بدل دیا کرتی، گھر میں تھا کون ایک مولوی صاحب، دوسرا ایک کانڑا ٹٹو بدھو نفر، ان کا نور خدا بخش، وہ بھی ایسا بے پرواکہ خدا کی پناہ، ظالم نے بہرا بن کر کام سے اور اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا، مولوی صاحب کی آواز جس سے مردے قبریں چونک پڑیں اسکو کبھی نہ سنائی دی، اور جبتک کسی نے جا کر اس کا شانہ نہ ہلایا، اس نے ہمیشہ سنی کو ان سنی کر دیا۔ البتہ حقہ کے معاملے میں بڑا تیز تھا یا تو اس کو یہ خیال تھا کہ حقے بغیر مولوی صاحب کے ہاں گزارہ ہونا مشکل ہے یا یہ وجہ تھی کہ

تمباکو زیادہ صرف کرتے ہیں اس کو دو ایک پیسے روز مل جاتے تھے۔ غرض یہ حال تھا کہ حقہ پورا سلگا بھی نہیں کہ وہ چلم اٹھا کر چلا۔ مولوی صاحب ہاں ہاں کرتے ہی رہے اس نے جا چلم الٹ دی، دوسرا سلفہ رکھ، آگ بھر، چلم حقہ پر لا کر رکھ دی، تو آگرم، حقہ بھڑک گیا، میاں نوکر صاحب کو پھر بلا کر توا ٹھنڈا کرنے اور چلم بھروانے کی ضرورت پیش آئی غرض سارے دن ان کا یہی کام تھا اور وہ اس میں بہت خوش اور مگن تھے۔

جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا پابند تھا کہ لوگ اس کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کر لیتے تھے، بعض یورپ پرست اس کی پابندی اوقات کو یورپ والوں کا ہی حصہ خیال کریں تو خیال کریں میں تو کہتا ہوں کہ میں نے صرف دہلی میں تین شخص ایسے دیکھے ہیں جو آندھی آئے مینھ آئے، روزانہ چھ بجے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں آتے تھے، ادھر انھوں نے لائبریری کے دروازے میں قدم رکھا اور ادھر گھنٹہ گھر نے ٹن ٹن چھ بجائے، لطف یہ ہے کہ ان میں سے ایک مشرق میں رہتا ہے تو دوسرا مغرب میں، یہ تین شخص کون تھے؟ ایک منشی ذکاء اللہ صاحب دوسرے رائے بہادر پیارے لال صاحب، اور تیسرے مولوی صاحب، ایک چیلوں کے کوچے سے آتا ہے، دوسرا دریبہ سے اور تیسرا کھاری باؤلی سے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک نے آکر دوسرے کا انتظار کیا ہو، اگر ان میں سے کوئی نہ آتا تھا تو ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا۔ کہ نہ آنے والا ایسا بیمار ہے کہ چلنا دشوار ہے اور یہ نتیجہ غلط ثابت نہیں ہوا میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے کہ اگر کسی شخص کو ان تینوں میں سے کسی سے ملنا ہوتا اور چھ بجے سے ذرا پہلے لائبریری کے کسی ملازم سے جا کر دریافت کرتا تو یہی جواب ملتا کہ اب آتے ہی ہوں گے چھ میں دو ہی منٹ تو رہ گئے ہیں؛ دوسرے دو صاحبوں کا ٹائم ٹیبل تو مجھے معلوم نہیں، البتہ مولوی صاحب کی مصروفیتوں کا حال لکھتا ہوں، ان کے اس نظام اوقات میں گرمی اور جاڑے کے لحاظ سے کچھ کچھ تغیر ہو جاتا تھا وہ

ہمیشہ بہت سویرے اٹھنے کے عادی تھے، گرمیوں میں اٹھتے ہی نہاتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر نماز پڑھتے ان کی صبح کی اور عصر کی نماز کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی، باقی کا حال اللہ کو معلوم ہے، نہ میں نے دریافت کیا اور نہ مجھ سے کسی نے کہا، صبح کی نماز پڑھ کر کچھ تلاوت کرتے، ادھر ذرا دن چڑھا ادھر مولویوں کی جماعت اور خود مولوی صاحب کا ناشتہ داخل ہوا۔ اس جماعت میں بخارا، کابل سرحد وغیرہ کے لوگ تھے۔ ان کی تعداد کوئی ۱۸، ۱۶ تھی، محنت ایسی کرتے تھے کہ کوئی دوسرا کرے تو مر جائے، لیکن ٹھوٹھ ایسے تھے کہ مولوی صاحب بھی ان سے زچ ہو جاتے تھے۔ خوش مذاقی تو انھیں چھو کر نہیں گئی تھی، خود مذاق کرنا تو کجا دوسرے کا مذاق بھی نہیں سمجھ سکتے تھے، متانت اور ادب کا یہ حال تھا کہ آنکھ اٹھا کر مولوی صاحب کو دیکھنا سوء ادبی سمجھتے تھے، اب ان کے "وہ عمامے اونچے اونچے یہ لمبی لمبی داڑھیاں" دیکھو اور مولوی صاحب کی حالت کا اندازہ کرو بیچارے ناشتہ کرتے جاتے اور اپنا فرض اتارتے جاتے تھے عالم تھے دوسروں کو عالم بناتے تھے، لیکن کہا کرتے تھے کہ "ان فتح پوری کے ملانوں کو پڑھا کر میرا دل بیٹھ جاتا ہے، کیا کہوں، میں ہوں ہنسوڑا تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں، کا نقشہ ہے"، یہ جماعت اٹھی اور مولوی رحیم بخش صاحب آنازل ہوئے، کاغذوں کا متھا بغل میں، ہاتھ میں پنسل، کان میں قلم، اِدھر فتحپوری کی جماعت نے کمرے سے قدم نکالا ادھر انھوں نے کمرے میں قدم رکھا اب سلسلہ تصنیف و تالیف شروع ہوا چونکہ آخر میں مولوی صاحب کے ہاتھ میں رعشہ آگیا تھا۔ اس لئے لکھوانے کا کام اکثر انھیں سے لیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے کلام مجید اور حمائل شریف کی کاپیوں کی صحت کی جاتی، اس کے بعد مطبع کا حساب دیکھا جاتا اور پھر جدید تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا، یہ کام سمٹتے سمٹتے ساڑھے گیارہ پونے بارہ بج جاتے، رحیم بخش صاحب اٹھتے ہی کھانا آتا کھانا کھایا اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ ادھر ڈیڑھ بجا اور ادھر ہم دونوں داخل

ہوئے، ہمارا قدم رکھنا تھا کہ مولوی صاحب اٹھ بیٹھے، ساڑھے تین بجے تک ہم سے سرمغزنی کرتے رہے۔ اگر کوئی دلچسپ بحث یا قصہ چھڑ گیا تو چار بج گئے، چار بجے اور مولوی صاحب غسلخانے میں گئے، نہائے دھوئے کپڑے پہن کر نکل کر کھڑے ہوئے پہلے شمس العارفین کی دوکان پر ٹھہرے یہاں بھی انکا حساب کتاب تھا، وہاں کا کھاتہ دیکھا، جو کچھ لینا دینا تھا لیا دیا اور سیدھے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں پہونچگئے، سات بجے تک وہاں ٹھہرے جس کو ملنا ہوا وہاں مل لیا، سات بجے وہاں سے اٹھ کر سراج الدین صاحب کی دوکان پر آئے، یہاں بھی حساب کیا عبدالرحمٰن کو پڑھایا گھنٹہ بھر یہاں ٹھہر کر مکان پہونچ گئے۔ کھانا کھایا۔ کچھ لکھا پڑھا اور دس بجے سو رہے جاڑے میں پروگرام میں تبدیلی ہوجاتی تھی۔ کہ پہلے صبح ہی صبح ہم پہنچتے تھے اسکے بعد مولویوں کی جماعت آتی تھی، رحیم بخش صاحب کا نمبر سہ پہر میں آتا تھا۔

خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھانا کھاتے تھے، ناشتے میں دو نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے، میوہ کا بڑا شوق تھا؛ ناشتہ اور کھانے کے ساتھ میوہ کا ہونا لازم تھا پڑھائے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے۔ مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریک طعام نہ ہوسکا، خیر ان پٹھانوں کی جماعت کی تو کیا صلاح کرتے ان کے لئے تو مولوی صاحب کا ناشتہ اونٹ کے ڈاڑھ میں زیرہ ہوجاتا، البتہ ہم دونوں کی صلاح نہ کرنا غضب تھا۔ کہتے بھی جاتے تھے " بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے۔ میاں کیا مزہ کا آم ہے۔" مگر بندہ خدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے میں نے تو تہیہ کرلیا تھا میاں داتی اب انکار کریں تو کریں لیکن ان کا بھی یہی ارادہ تھا) کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے منھ بھی شریک ہونے کو کہیں تو ہم سچ مچ شریک ہوجائیں۔

مولوی صاحب کو مسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا شوق تھا اور اس غرض کے حاصل کرنے میں ان کو مالی مدد دینے میں کبھی انکار نہ ہوتا تھا، بے دریغ روپیہ بنے

تھے اور اکثر بڑی بڑی رقمیں ڈبو بیٹھتے تھے، کہا کرتے تھے "میاں میں سچ کہتا ہوں کہ اس تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپیہ کھو بیٹھا ہوں پھر بھی جو کچھ مجھے بعض کھرے دوکانداروں سے پہنچا ہے اس نے میرے نقصان کی تلافی ہی نہیں کردی بلکہ کچھ نفع ہی پہنچا دیا ہے، بیٹا تم بھی تجارت کرو، روپیہ میں دیتا ہوں نوکری کی کھکھیڑ اٹھاؤ گے تو مزا معلوم ہوگا جس طرح روپیہ دل کھول کر دیتے تھے۔ اسی طرح حساب بھی بڑی سختی سے لیتے تھے، گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا مینھ قرضداروں کے ہاں ان کا روزانہ چکر نہ چھوٹتا تھا گئے اور جاتے ہی پہلے "غلق" پر قبضہ کیا اسکے بعد کھاتہ دیکھا، گردی دیکھی، سامان دیکھ بکری کا اندازہ کیا، روپیہ جیب میں ڈالا اسلام علیکم وعلیکم السّلام کیا اور چل دیئے دوسرے دوکاندار کے پاس پہنچے اور وہاں بھی وہی پہلا سبق دہرایا، کوڑی کوڑی کا حساب دیکھتے، اعتراضوں کی بوچھار سے پریشان کرتے اور کہتے جاتے "بھئی حساب جو جو بخشش سو سو" فقرے کے پہلے جز سے تو بیچاروں کو روزانہ واسطہ پڑتا لیکن دوسرے جز کا دیکھنا کبھی کسی کو نصیب نہ ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ اگر واقعی بازار کے مندا ہونے یا کسی اور وجہ سے ان کے کسی قرضدار کا نقصان ہوتا یا دیوالیہ نکل جاتا تو پھر اس قرضے کا ذکر زبان پر نہ لاتے، ان کو خیال تھا کہ دلی کے پنجابی تجارت کو خوب سمجھتے ہیں ان کو دل کھول کر روپیہ دیتے تھے، اور اکثر ان ہی کے ہاتھوں نقصان اٹھاتے تھے مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں، ایک صاحب جن کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں، مولوی صاحب کے پاس آئے۔ تجارت کا ذکر چھیڑا، اور مولوی صاحب کو ولایتی جوتوں کے فائدے کے وہ سبز باغ دکھائے کہ تیسرے ہی روز بلا کسی طمانیت کے گیارہ ہزار روپے کا چک مولوی صاحب نے ان کے نام لکھ دیا، بڑے ٹھاٹھ سے سنہری مسجد کے قریب دوکان کھولی گئی، مولوی صاحب جاتے، گھڑی دو گھڑی وہاں بیٹھتے دوکاندار صاحب کی لچھے دار باتیں سنتے، چلتے وقت کچھ روپیہ جیب میں

ڈالنے کو مل جاتے۔ اس لئے خوش خوش بغیر حساب کتاب دیکھے روپے کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے تھے، قصّہ مختصر، اصل میں سے دو ڈھائی ہزار مولوی صاحب کو تھما اس نے دیوالیہ نکال دیا، قرقی ہوئی، مال نیلام چڑھا اور اس میرے یار نے کل سامان دوسروں کے ذریعہ سے خود خرید لیا، مولوی صاحب کو اس چال کی کانوں کان خبر نہ ہوئی، اس کے لئے آیا، بہت رویا، بہت آنسو بہائے، مولوی صاحب سمجھے بیچارے کو بڑا رنج ہوا کہا بھئی جاؤ تجارت میں یہی ہوتا ہے، "یا اس پار یا اس پار" چلو گئی گذری بات ہوئی ایک روز خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ یہ چاوڑی میں جارہے تھے کچھ جھٹپٹا ہوا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دوکاندار صاحب خوب بنے، عطر میں بسے، پھولوں کا کنٹھا گلے میں ڈالے ایک رنڈی کا ہاتھ پکڑے کوٹھے سے اترے اور آکر ایک کھلی گاڑی میں سوار ہوئے، مولوی صاحب نے جو یہ رنگ دیکھا تو وہیں ٹھٹک گئے، اتنے میں انھوں نے بھی مولوی صاحب کو دیکھا بہت مسکرا کر سلام کیا۔ رنڈی نے چپکے چپکے کچھ دریافت کیا تو ایک قہقہہ لگایا اور اونچی آواز میں کہا کہ "یہ سب کچھ مولوی صاحب ہی کی جوتیوں کا صدقہ" مولوی صاحب کے آگ لگ گئی، دوسرے ہی دن نالش ٹھونک دی اور آخر کار ان کو ٹھکانے لگا کر دم لیا، لوگوں نے سفارشیں بھی کیں، انھوں نے خود بھی آکر بہت کچھ توبہ تلا کی۔ لیکن یہ نہ ماننا تھا نہ مانے اور آخر جب اسکو کھک کر دیا اس وقت ان کو چین آیا۔

دین لین سب کچھ کرتے تھے مگر حساب کتاب صرف دوسروں کی کتابوں یا انکے دل میں تھا، کچھ تھوڑا بہت لوگوں کے کہنے سننے سے متفرق پرچوں پر لکھ بھی لیا تھا، لیکن اتنے بڑے بیوپار کے لئے جیسا دفتر چاہئے وہ انھوں نے نہ رکھنا تھا نہ رکھا۔ سود لینا وہ جائز سمجھتے تھے اگر کوئی حجت کرتا تو مارے تاویلوں کے اسکا ناطقہ بند کر دیتے ایک تو حافظ، دوسرے عالم تیسرے لسان، بھلا ان سے کون در آسکتا تھا

اور تو اور خود مجھ سے سود لینے کو تیار ہو گئے، واقعہ یہ ہے کہ ہم پر متفرق قرضے تھے، خیال آیا کہ ایک جگہ سے قرض لے کر سب کو ادا کر دیا جائے۔ قرضہ کس سے لیا جائے؟ یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا، ہر پھر کر مولوی صاحب ہی پر نظر جاتی تھی، آخر ایک دن جی کڑا کر کے میں نے مولوی صاحب سے سوال کر ہی دیا، کہنے لگے "کتنا روپیہ چاہئے"، میں نے کہا "بارہ ہزار" بولے "ضمانت" میں نے کہا چوڑی والوں کا مکان، پوچھا کتنی مالیت کا ہے میں نے کہا کوئی ساٹھ ستر ہزار روپے کا فرمایا "کل قبالہ لیتے آنا"، میں نے دل میں سوچا چلو چھٹی ہوئی۔ بڑی جلدی معاملہ پٹ گیا، دوسرے دن قبالہ لیکر پہنچا، پڑھ کر کہا "ٹھیک ہے، مگر بیٹا سود کیا دو گے۔ میں نے کہا "مولوی صاحب آپ اور سود۔" کہنے لگے "کیوں اس میں کیا ہرج ہے میں نہ دوں گا تو کسی ساہوکار سے لوگے، اسکو خوشی سے سود دو گے، ارے میاں مجھے کچھ فائدہ پہنچاؤ گے تو دین و دنیا دونوں میں بھلا ہوگا، آخر میں تمھارا استاد ہوں یا نہیں، میرا ابھی کچھ حق تم پر ہے یا نہیں، جاؤ شاباش بیٹا اپنے چچا سے جا کر تصفیہ کراؤ، کل ہی چک بنگال بنک کے نام لکھے دیتا ہوں" میں نے کہا "مولوی صاحب لوگ کیا کہیں گے کہ مولوی ہو کر سود لیتے ہیں، اور لیتے ہیں کس سے، کہ اپنے شاگردوں سے" کہنے لگے "اس کی پروا نہ کرو جب مجھ پر کفر کا فتوی لگ چکا ہے تو اب مجھے ڈر ہی کیا رہا، جاؤ تمھارے ساتھ یہ رعایت کرتا ہوں کہ اوروں سے روپیہ سیکڑہ لیتا ہوں تم سے چودہ آنے لوں گا۔" میں نے آ کر گھر میں ذکر کیا ہم کو دوسری جگہ سے آٹھ آنے سیکڑہ روپیہ مل گیا، اس لئے یہ معاملہ یونہی رہ گیا۔

لیجئے یہ قصہ تو سنا چکا، اب اصل کہانی کی طرف رجوع کرتا ہوں اور مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم کے واقعات جو ان کی زبانی سنے تھے بیان کرتا ہوں۔

ایک روز مولوی صاحب معلقات پڑھا رہے تھے، عمرو بن کلثوم کا قصیدہ تھا جب اس شعر پر پہنچے

ع ابا ہند فلا تعجل علینا وانظرنا نخبرک الیقینا

تو بہت ہنسے کتاب رکھدی اور ہنستے ہنستے لوٹ گئے، ہماری سمجھ میں نہ آیا تھا کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے، شعر میں تو کوئی ہنسی کی بات نہیں، پھر مولوی صاحب کو یہ کیا مرض اٹھا ہے، آخر جب ہنسنے کا ذرا زور کم ہوا تو وجہ دریافت کی، مولوی صاحب پھر ہنسنے لگے، تھوڑی دیر کے بعد سنبھل کر بولے "میاں بعض شعر قصہ طلب ہوتے ہیں، یہ شعر میری زندگی کے قصہ کا آغاز ہے۔ اچھا لو سناتا ہوں۔ مگر پہلے تمہید سن لو، کبھی ہم بہت غریب لوگ تھے، نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا، تعلیم کا شوق تھا، اس لئے پھرتا پھراتا پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں آکر ٹھہر گیا۔ یہاں کے مولوی صاحب بڑے عالم تھے ان سے پڑھتا اور توکل پر گزارہ کرتا، مولوی صاحب کے دو چار شاگرد اور بھی تھے، انھیں بھی پڑھاتے مجھے بھی پڑھاتے دن رات پڑھنے کے سوا کچھ کام نہ تھا، تھوڑے سے دنوں میں کلام مجید پڑھ کر میں نے ادب پڑھنا شروع کیا، چار برس میں معلقات پڑھنے لگا۔ گو میری عمر بارہ سال کی تھی۔ مگر قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے نو دس برس کا معلوم ہوتا تھا۔ پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا، صبح ہوئی اور میں چھڑی ہاتھ میں لیکر گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دیدی کسی نے قیمہ کی لگدی ہی رکھدی، کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخا دیا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ انھیں کے بیٹے ڈپٹی عبدالحامد ہیں جو سامنے والے مکان میں رہتے تھے، ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ ادھر میں نے دروازے میں قدم رکھا، ادھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی، جبتک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے پسوا نہ لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا، خدا جانے کہاں سے محلہ بھر کا مصالحہ اٹھا لاتی تھی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے، جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا، بخدا جان سی نکل جاتی تھی، میں نے مولوی صاحب سے کئی دفعہ شکایت بھی کی، مگر انھوں نے ٹال دیا۔ خبر نہیں مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ چلتے چلتے تاکید کر دیا کرتے تھے کہ عبدالخالق صاحب کے

مکان میں ضرور جانا، بہر حال مارا دھاڑی روز وہاں جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی۔ تم سمجھے بھی کہ یہ لڑکی کون تھی، میاں یہ لڑکی وہ تھی، جو بعد میں ہماری بیگم صاحبہ ہوئیں، جب سوچتا ہوں تو پچھلا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، اور بے اختیار ہنسی آجاتی ہے اکثر ہم دونوں پہلی باتوں کو یاد کرتے اور خوب ہنستے تھے، خدا غریق رحمت کرے جیسی بچپن میں شریر تھیں ویسی ہی جوانی میں غریب ہوگئیں، انکے مرنے کے بعد ہماری تو زندگی کا مزہ جاتا رہا، بھئی دیکھنا میں نے بھی کیسی مزے کی تاریخ کہی ہے:" اس کے بعد انھوں نے عربی کے چار پانچ اشعار قطعہ سنایا۔ مادۂ تاریخ "لہا غفرا" تھا، میں نے بڑی زور سے "اوں ہوں" کی بگڑ کر میری طرف دیکھا، اور کہا "کیوں آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے" میں نے عرض کی جی نہیں، لیکن اس قطعہ کو سن کر مجھے دبیر کی ایک رباعی یاد آگئی، فرماتے ہیں ؎

ہم شان نجف نہ عرش انور ٹھہرا — میزان میں یہ بھاری وہ سبکتر ٹھہرا
اس پلے میں تھا نجف اس پلے میں عرش — پہنچا وہ فلک پر یہ زمین پر ٹھہرا

بڑے غور سے سنتے رہے پھر کہنے لگے "یہ تو بے معنی ہے نجف کی جگہ دنیا کی جس چیز کو رکھدو اس سے یہ رباعی متعلق ہو جائے گی اور وہ عرش سے بھاری ثابت ہوگی" میں نے عرض کی کہ آپکے قطعہ کو اس سال میں مرنے والی جس عورت سے متعلق کردیں متعلق ہو جائیگا اس تاریخ میں خوبی ہی کیا ہے۔ اول تو ایسی عام تاریخیں کچھ قابل تعریف نہیں ہوتیں دوسرے سرسید کی تاریخ انتقال "غفرا لہٗ" پر آپ نے صرف الف کا اضافہ کرکے اسکو اپنا مال کرلیا ہے، مسکرا کر کہنے لگے "اچھا بھئی تو ہی سچا سہی، خیر اب اس جھگڑے کو چھوڑ دو اور میری اصل کہانی کو لو، ہاں تو فرصت کے وقت ہم دلی کی گلیوں کا چکر لگاتے کبھی کبھی کشمیری دروازے کی طرف بھی نکل جاتے، ایک روز جو کشمیری دروازہ کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دلی کالج میں بڑا ہجوم ہے، کالج وہاں تھا جہاں اب گورنمنٹ اسکول

ہے، میں بھی بھیڑ میں گھس گیا۔ معلوم ہوا کہ لڑکوں کا امتحان لینے مفتی صدرالدین صاحب
آئے ہیں۔ ہم نے کہا چلو ہم بھی دیکھیں، برآمدے میں پہنچا، قد چھوٹا تھا، لوگوں کی ٹانگوں میں
سے ہوتا ہوا گھس گھسا کر کمرے کے دروازے تک پہنچ ہی گیا، دیکھا کہ کمرے کے بیچ
میں میز بچھی ہے۔ اس کے سامنے کرسی پر مفتی صاحب بیٹھے ہیں، ایک ایک لڑکا آتا ہے
اس سے سوال کرتے ہیں اور سامنے کاغذ پہ کچھ لکھتے جاتے ہیں میز کے دوسرے پہلو کی
کرسی پر ایک انگریز بیٹھا ہے، یہ مدرسے کے پرنسپل صاحب تھے، ہم تماشے میں محو تھے کہ صاحب
کسی کام کے لئے اٹھے، چپراسیوں نے راستہ صاف کرنا شروع کیا۔ جو لوگ دروازہ روکے
کھڑے تھے غرض اس دھکا پیل میں میرا قلیہ ہوگیا، دروازے کے سامنے سنگ مرمر کا فرش تھا، اس
پر سے میرا پاؤں رپٹا اور میں دھم سے گرا۔ اتنی دیر میں پرنسپل صاحب بھی دروازے
تک آگئے تھے، انھوں نے مجھے گرتے دیکھا تو دوڑ کر میری طرف بڑھے مجھے اٹھایا، پوچھتے
رہے کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی، ان کی شفقت آمیز باتیں اب تک میرے دل پر کالنقش
فی الحجر ہیں باتوں ہی باتوں میں پوچھا۔ میاں صاحبزادے کیا پڑھتے ہو؟ میں نے کہا "معلقات"
ان کو بڑا تعجب ہوا پھر پوچھا، میں نے پھر وہی جواب دیا، میری عمر پوچھی میں نے کہا "مجھے کیا
معلوم" وہ میرا ہاتھ پکڑ بجائے اپنے کام کو جانے کے سیدھا مجھ کو مفتی صاحب کے پاس لے
گئے اور کہنے لگے "مفتی صاحب یہ لڑکا کہتا ہے میں معلقات پڑھتا ہوں، ذرا دیکھئے تو
سہی سچ کہتا ہے یا یونہی بناتا ہے"۔ مفتی صاحب نے کہا "تو کیا پڑھتا ہے؟" میں نے کہا
"معلقات"! کہنے لگے "کہاں پڑھتا ہے؟" میں نے کہا "پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں"
پھر کہا "معلقات دوں پڑھے گا۔" میں نے کہا "لائیے" انھوں نے میز پر سے کتاب اٹھائی
میرے ہاتھ میں دی اور کہا "یہاں سے پڑھ" جس شعر پر انھوں نے انگلی رکھی تھی وہ یہی شعر تھا

ابا ھند فلا تعجل علینا  وانظرنا نخبرک الیقینا

میں نے پڑھا معنی بیان کئے، انھوں نے ترکیب پوچھی وہ بیان کی، میاں دانی

تمھاری طرح میں نے شعر نہیں پڑھا تھا اور میاں فرحت تمہاری طرح ترکیب نہیں کی تھی"
(مولوی صاحب کا یہ اشارہ ہماری کمزوریوں کی طرف تھا۔ اس کا ذکر آئندہ آئے گا)
مفتی صاحب بہت چکرائے، پوچھنے لگے "تجھ کو کون پڑھاتا ہے" میں نے کہا مسجد کے
مولوی صاحب، کہا" مدرسہ میں پڑھے گا، میں نے جواب دیا "ضرور پڑھوں گا" مفتی صاحب
قلم اٹھا کاغذ پر چند سطریں لکھیں اور پرنسپل صاحب کو دیکر کہا" اس کو پریذیڈنٹ صاحب
کے پاس پیش کر دینا" ہم وہاں سے نکل اپنے گھر آئے، مولوی صاحب سے کچھ نہ
کہا، کوئی سات آٹھ روز کے بعد کالج کا چپراسی مولوی صاحب کے پاس ایک کاغذ دے
گیا، اس میں لکھا تھا کہ نذیر احمد کو کالج میں داخل کرنے کی اجازت ہوگئی ہے کل سے
آپ اسکو کالج میں آنے کی ہدایت کر دیجئے اسکا وظیفہ ہوگیا ہے، چپراسی تو یہ حکم دے
چلتا بنا، مولوی صاحب نے مجھ کو بلایا خط دکھایا، پوچھا یہ کیا معاملہ ہے، میں نے کچھ
جواب نہ دیا۔ جب ذرا سختی کی تو تمام واقعہ بیان کیا وہ بہت خوش ہوئے اور دوسرے
روز لے جا میرا ہاتھ پرنسپل صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس زمانے میں سید احمد خاں
فارسی کی جماعت میں، منشی ذکاء اللہ حساب کی جماعت میں اور پیارے لال انگریزی
کی جماعت میں پڑھتے تھے، میں عربی کی جماعت میں شریک ہوا، ایک تو شوق، دوسرے
پڑھانے والے ہوشیار، تیسرے ایک مضمون اور وہ بھی ایسا جس کا مجھے بچپن سے شوق تھا
تھوڑی ہی دنوں میں نے اپنی سب جماعت والوں کو دبا لیا۔ اب جب کبھی یہ شعر پڑھتا ہوں
تو پہلا زمانہ یاد آجاتا ہے اور میں بے اختیار ہنسنے لگتا ہوں۔ یہ کہتے ہی انھوں نے لہک لہک کر
یہ شعر ؎

ابا ھند فلا تعجل علینا وانظرنا نخبرک الیقینا

پڑھنا اور ہنسنا شروع کیا۔

میں نے کہا مولوی صاحب آپ کی جماعت کہاں بیٹھتی تھی، کہنے لگے پرنسپل صاحب

کے کمرے کے بازو میں جو چھوٹا کمرہ ہے اس میں ہماری جماعت تھی، دوسرے پہلو میں جو کمرہ ہے اس میں فارسی کی جماعت، دانی نے کہا "مولوی صاحب آپ کے اختیاری مضمون کیا تھے، مولوی صاحب ہنسے اور کہا "میاں نانی! ہم پڑھتے تھے، آجکل کے طالبعلموں کی طرح چوتڑوں سے گھاس نہیں کاٹتے تھے۔ (مولوی صاحب اس فقرہ کا اکثر استعمال کیا کرتے تھے، معلوم نہیں کہاں کا محاورہ ہے) ارے بھئی ایک ہی مضمون کی تکمیل کرنا دشوار ہے، آجکل پڑھاتے نہیں لادتے ہیں، آج پڑھا کل بھولے۔ تمہاری تعلیم ایسی دیوار ہے جس میں گارے کا بھی رواہے، ٹھیکریاں بھی گھسیٹر دی گئی ہیں، مٹی بھی ہے، پتھر بھی ہے، کہیں چونا اور اینٹ بھی ہے۔ ایک دھکا دیا اور اڑاڑا دھم گری، ہم کو اس زمانے میں ایک مضمون پڑھاتے تھے مگر اس میں کامل کر دیتے تھے، پڑھانے والے بھی ایرے غیرے پچکلیان نہیں ہوتے تھے، ایسے کو چھانٹا جاتا تھا، جن کے سامنے آجکل کے عالم محض کاٹھ کے الّو ہیں، اچھا بھئی اچھا آگے چلو۔

با نا نو رد ت الہ ایات بیصا    و نصدر ھن جمر اً قدر ا دینا

میں نے کہا مولوی صاحب پہلے شعر کے معنی تو رہ ہی گئے کہنے لگے اتنا بڑا قصہ سنا دیا۔ اس کے بعد بھی اس شعر کے معنوں کی ضرورت ہے، بس اسکے یہی معنی ہیں کہ تحقیق ایک ملّا کا بیٹا ڈاکٹر، ڈپٹی شمس العلماء ایل۔ ایل ڈی ہو گیا ساتھ آسانی کے بیچ اسی دلی کے، بوجہ اس شعر کے،

مولوی صاحب کی تعلیم کا حال سن چکے، اب ہماری تعلیم کا حال سنئے اور قصہ کو سراج الدین صاحب کی دوکان کے واقعہ کے دوسرے روز سے لیجئے۔

میں اور میاں دانی ساڑھے گیارہ بجے مدرسہ سے آئے کھانا دانا کھایا سبق کا مطالعہ کیا۔ اور ایک بجے نکل کھڑے ہوئے۔ مکان کا پتہ پوچھتے پوچھاتے ڈیڑھ میں پانچ منٹ تھے۔ کہ مولوی صاحب کے دروازے پر جا دھمکے، دروازے کی ایک چوکی پر

میں اور دوسری پر میاں دانی ڈٹ گئے۔ سامنے ہی کمرہ تھا بی جماری رستی ہاتھ میں لئے اونگھ رہی تھیں، کبھی کبھی رستی کو ایک آدھ جھٹکا دیدیتی تھیں، کمرے کے اندر مولوی صاحب تھے لیکن دروازہ بند تھا۔ اس لئے دکھائی نہ دیتے تھے، اب یہ خیال ہوا کہ یہ مولوی صاحب ہی کا مکان ہے یا کسی دوسرے کا اندر زنانہ تو نہیں ہے۔ غرض اسی شش و پنج میں تھے کہ مولوی صاحب کے کمرے کے گھنٹے نے ٹن سے ڈیڑھ بجایا، ہم دونوں اٹھے اور دبے پاؤں چوروں کی طرح اندر داخل ہوئے۔ گھر میں سناٹا تھا بی جماری نے سر بھی اٹھا کر نہ دیکھا کہ کون جا رہا تھا، کمرہ کا ایک دروازہ کھلا تھا۔ اس میں گردن ڈال کر جھانکا۔ چونکہ روشنی سے اندھیرے میں آئے تھے۔ اس لئے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا "کون ہے" اس آواز کو پہچان کر ہم تو سنبھل گئے۔ مگر بی جماری اچھل پڑیں، اور بے اختیار ان... کے منھ سے گنبد کی آواز کی طرح نکلا "کون ہے" میں نے کہا' میں اور دانی۔ "مولوی صاحب نے کہا آؤ بیٹا، اندر آؤ" مولوی صاحب فوراً پلنگ پر اٹھ بیٹھے اور تہمد سنبھالتے ہوئے نیچے اتر آئے، پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ ہم نے کتاب پیش کی، تھوڑی دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، اسکے بعد کہا" ایک کتاب میرے لئے بھی لیتے آنا ہم نے اپنی ایک کتاب ان کو دیدی اور دوسری سے دونوں مل کر کام نکالا۔ کیا پڑھایا اور کس طرح پڑھایا، اس کا میں آئندہ ذکر کروں گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب پڑھ کر اٹھے تو سب کچھ یاد تھا۔ مگر دماغ پر کسی قسم کا بار نہ تھا۔ خوشی خوشی گھر آئے۔ چلو اللہ دے اور بندہ لے،

ہم نے بھی کالج میں مولوی صاحب کی تعریفوں کے پل باندھ دئے یہانتک کہ یہ آواز ہندو کالج کے طلبار کے کان تک پہنچی، وہاں کے ایک طالبعلم مسٹر رضا کے دل میں گدگدی اٹھی، وہ آئے ہم سے ملے اور کہا "بھئی میں بھی تمہارے ساتھ چلوں مولوی صاحب انکار تو نہ کریں گے" ہم نے کہا "چلو اور ضرور چلو، مولوی صاحب کا کیا بگڑتا ہے۔ دو کو نہ پڑھایا"

تین کو پڑھایا۔" انھوں نے کہا پہلے مولوی صاحب سے پوچھ لو ہم نے کہا یار چلو بھی اگر انھوں نے کچھ کہا تو ہمارا ذمہ وہ راضی نہ ہوئے اور یہی کہا کہ پہلے پوچھ لو اس عرصہ میں ہماری ہمت مولوی صاحب کے سامنے بہت بڑھ گئی تھی دوسرے دن جاتے ہی رضا کا ذکر کیا انھوں نے کہا: "لیتے کیوں نہ آئے" ہم نے کہا وہ ذرا شرمیلے ہیں بغیر اجازت آنا نہیں چاہتے، انھوں نے کہا: "طالب علم شرمیلا ہوا اور ڈوبا۔ خیر کل ضرور ساتھ لانا ذرا ان کا بھی رنگ دیکھ لوں" شام کو واپسی کے وقت جاتے جاتے فراش خانے میں ہم نے رضا کو مولوی صاحب کا اجازت نامہ پہنچایا اور کہدیا کہ بھئی پورے ڈیڑھ بجے پہنچ جانا ورنہ اندر گھسنا نہ ملے گا۔ دوسرے دن جو ہم پہنچے تو وہ پہلے ہی سے دروازے پر دھونی دیئے بیٹھے تھے۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے ہم اندر داخل ہوئے، مولوی صاحب کو ہم دیکھتے ہی پلنگ پر اٹھ بیٹھے اور کہا: "لاؤ کتاب" ہم نے کتاب طاق پر سے اتار ان کے ہاتھ میں دی اور وہ کتاب لیتے لیتے نیچے آ بیٹھے اور کہا: "اچھا یہ ہیں میاں رضا" بیچارے رضا نے گردن جھکا کر کہا "جی ہاں" مولوی صاحب نے کہا۔ "اچھا بھئی شروع کرو۔"

ہمارے پڑھنا کا یہ طریقہ تھا کہ ایک روز میں پڑھتا تھا، دوسرے روز میاں دانی اب اسکو ہماری شرارت کہو یا محض اتفاق، ہم دونوں چپکے بیٹھے رہے جب اس خاموشی نے طول کھینچا تو مولوی صاحب نے کہا "ارے بھئی آج تم پڑھتے کیوں نہیں کیا منھ میں گھنگھنیاں بھر کر آئے ہو" اچھا میاں رضا تم ہی شروع کرو، رضا نے صفحہ پوچھا اور پڑھنا شروع کیا، اگر اعراب کی غلطیاں مجھ سے کم کیں تو نظم کو نثر، میاں دانی سے زیادہ بنا دیا، ایک آدھ شعر تک تو مولوی صاحب چپکے سنتے رہے۔ اس کے بعد کہنے لگے "واہ بھئی واہ ہم کو بھی عجب نمونے کے شاگرد ملے ہیں، میاں رضا اگر ہم تم کو ایک نیک صلاح دیں تو مانو گے" رضا نے نہایت شرمیلی آواز میں گردن جھکا کر کہا۔ "بسر و چشم" مولوی صاحب نے کہا دیکھو اپنے وعدے سے پھر نہ جانا" انھوں نے کہا "جی نہیں" مولوی صاحب

کہا" اچھا تو میری یہ صلاح ہے کہ کل سے تم میرے ہاں نہ آنا"۔ یہ سن کر وہ بیچارے کچھ پژمردہ ہو گئے، مولوی صاحب نے کہا" بھئی رضا میں یہ نہیں کہتا کہ میرے ہاں آنا ہی چھوڑ دو میں تم کو ضرور پڑھاؤں گا، مگر تم دس پندرہ روز شام کے وقت کالی جان کے ہاں تعلیم میں ہو آیا کرو، اتنے دنوں کے آنے جانے میں تمھارے کانوں کو نظم اور نثر کا فرق معلوم ہونے لگے گا، بھئی مجھ سے تو شعروں کے گلے پر چھری پھرتے دیکھا نہیں جاتا، بیچارے متبنی کو کیا خبر تھی کہ بتاشوں کی گلی میں نذیر احمد کے کمرے میں اس کے اشعار مولوی رضا صاحب اس طرح حلال کریں گے بیچارے رضا کے سر پر گھڑوں پانی پڑ گیا خدا خدا کر کے سبق ختم ہوا اور ہم سب، رخصت ہوئے راستہ میں ہم نے ان کو بہت بنایا، دوسرے روز سے وہ ایسے غائب ہوئے پھر شکل نہ دکھائی،

مسٹر رضا کی حیا کا حال تو سن چکے اب ہماری بے حیائی کی داستان سنئے میری صرف و نحو کمزور تھی، اور کمزور کیوں نہ ہوتی، شروع کئے ہوئے کے دن ہوئے تھے اعراب میں ہمیشہ غلطی کرتا تھا، نثر کو تو سنبھال لیتا تھا مگر نظم میں دقت پڑتی تھی۔ شعر خود بھی کہتا تھا، دوسروں کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ اس لئے شعر کو تقطیع سے گرنے نہ دیتا تھا۔ میاں دانی کی حالت اسکے بالکل برعکس تھی وہ اعراب کی غلطی نہ کرتے تھے، مگر شعر کو نثر کر دیتے تھے۔ سکتے تو کیا جھٹکے پڑ جاتے تھے، مولوی صاحب ہم دونوں کے پڑھنے سے بہت جز بز ہوتے تھے ایک دن یہ ہوا کہ میرے پڑھنے کی باری تھی، میں نے ایک شعر پڑھا۔ معلوم نہیں کہاں کے اعراب کہاں لگا گیا، مولوی صاحب نے کہا" ہیں کیا پڑھا" میں سمجھا اعراب میں کہیں غلطی ضرور ہوئی۔ تمام اعراب بدل کر شعر موزوں کر دیا، انھوں نے پھر بڑے زور سے "ہوں" کی ہم نے پھر اعراب بدل دیئے۔ اس سے ان کو غصہ آگیا، کہا" دانی تم تو پڑھو، انھوں نے شعر کا گلا ہی گھونٹ دیا، خاصے بھلے چنگے شعر کو نثر بنا دیا، اب کیا تھا، مولوی صاحب کا پارہ اکیسو دس ڈگری پر

چڑھ گیا کتاب اٹھا کر پھینکی تو کمرہ سے گذر دالان میں ہوتی ہوئی صحن میں پہنچی اور نہایت غصیلی آواز میں کہا "نکل جاؤ" "ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ، نہ تم مجھ سے پڑھنے کے قابل رہو، اور نہ میں تمھارے پڑھانے کے لائق" دانی نے میری طرف دیکھا میں نے دانی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "چلو" میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا، ہرگز نہیں" انھوں نے اٹھنے کا ارادہ کیا، میں نے ان کا زانو دبایا، مولوی صاحب کی یہ حالت تھی کہ شیر کی طرح بپھر رہے تھے۔ آخر جب دیکھا کہ یہ لونڈے ٹس سے مس نہیں ہوتے تو کہنے لگے کہ اب جاتے ہو یا نہیں میں نے کہا "مولوی صاحب جبتک کوئی دھکے دیکر نہ نکالے گا، اسوقت تک تو ہم جاتے نہیں اور جائیں تو پھر ابھی آجائیں گے" مولوی صاحب نے جو یہ بیحیائی دیکھی تو ذرا نرم ہوئے کہنے لگے اچھا نہیں جاتے تو نہ جاؤ۔ مگر میں تم کو ایک حرف نہ پڑھاؤں گا" میں نے کہا "نہ پڑھایئے مگر بغیر پڑھے ہم یہاں سے نہ ٹلے ہیں نہ ٹلیں گے کہنے لگے "بیٹا، اسوقت میری طبیعت خراب ہوگئی ہے، اب چلے جاؤ کل آجانا" دانی نے سچ جانا، میں سمجھا کہ اسوقت اٹھے تو مولوی صاحب ہاتھ سے گئے، دانی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے پکڑ کر ان کو بٹھالیا مولوی صاحب یہ تماشا دیکھتے رہے میں نے کہا "مولوی صاحب پڑھیں گے تو آج پڑھینگے اور آج پڑھیں گے تو اسوقت پڑھیں گے، پڑھانا ہے تو پڑھایئے۔ ورنہ ہمکو یہاں سے نہ جانا ہے نہ جائیں گے" آخر کار ہم جیتے اور مولوی صاحب ہارے کہنے لگے "خدا محفوظ رکھے، تم جیسے شاگرد بھی کسی کے نہ ہوں گے۔ شاگرد کیا ہوئے استاد کے استاد ہوگئے، اچھا بھئی میں ہارا، اچھا خدا کے لئے کتاب اٹھالاؤ، اور سبق پڑھ کر میرا پنڈا چھوڑو دیکھئے کون سا دن ہوتا ہے کہ میرا تم سے چھٹکارا ہوتا ہے" میں جا کر صحن میں سے کتاب اٹھالایا اور مولوی صاحب.... جیسے تھے ویسے کے ویسے ہوگئے، کہا کرتے تھے کہ اگر اس روز تم چلے جاتے تو میرے گھر میں گھسنا نصیب نہ ہوتا۔ میں تمھارے شوق کو

آزماتا تھا مگر تم نے مجھے ہی آزما ڈالا، خدا ایسے شاگرد سب کو نصیب کرے، یہ بیجائی نہیں میاں یہ شوق ہے۔ علم کا جس کو چسکا ہوتا ہے وہ بُری بھلی سب ہی کچھ سنتا ہے بدشوق بھاگ نکلتے ہیں اور شوقین استاد کو دبا لیتے ہیں۔

پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم سے کسی نے کتاب میں سے ایک شعر پڑھا اور مولوی صاحب نے کتاب الٹ کر میز پر رکھدی پہلے دانی کی طرف متوجہ ہوئے اور صرف ونحو کے نکات پر بحث شروع ہوئی، اس بحث میں مجھے بارہ پتھر باہر سمجھ لیا تھا کبھی میں نے دخل بھی دیا تو مولوی صاحب نے فرمایا "آپ مہربانی کر کے اس بارے میں اپنے دماغ پر زور ڈالنے کی تکلیف گوارا نہ فرمایئے" اسکے بعد معنی بیان کئے، نکات بتائے اور پھر اسی مضمون کے اشعار اور مقولوں کا سلسلہ چھڑا۔ اب میاں دانی خارج از بحث ہو گئے، اول تو مجھے یوں ہی ہزاروں شعر یاد تھے دوسرے خاص طور پر تیار ہو کر جاتا تھا، مولوی صاحب اگر ایک شعر پڑھتے تو میں دو پڑھنے کو تیار ہو جاتا، غرض جب فریقین اپنا ہندوستانی گولہ بارود ختم کر چکتے تو یورپ اور انگلستان کے شعراء اور فلسفیوں کے مقولوں کا نمبر آتا اس میں میاں دانی بھی شریک ہو جاتے، اگر کوئی شعر قصہ طلب ہوا اور اسی قسم کا کوئی ماجرا مولوی صاحب پر گذرا ہوتا تو اس قصہ کے ساتھ اپنا قصہ بھی ضرور بیان کر دیتے غرض ایک شعر کی تصریح میں آدھ آدھ گھنٹہ گذر جاتا، مگر اسکے بعد جو شعر ذہن نشین ہوتا تو اس کا محو ہونا مشکل تھا۔ چنانچہ ابتک مجھے اکثر شعر یاد ہیں اگر کوئی رزمیہ قصیدہ ہوا تو اس سلسلہ میں اکثر غدر کے حالات بیان کرتے اور جو کچھ شر خائے دہلی پر اس طوفان بدتمیزی میں گذری تھی اسکی داستان نہایت دردناک الفاظ میں سناتے اکثر کہا کرتے تھے" میاں بیچارہ بہادر شاہ مجبور تھا، کسی اور پر بھی اگر یہی مصیبت نازل ہوتی تو وہ بھی اسی طرح ان بدمعاش تلنگوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا، یہ لوگ کوئی بادشاہ کو فائدہ پہنچانے تھوڑے آئے تھے ان کا مقصد تو شہر کا لوٹنا۔ وہ پورا ہوا اور انھوں نے دہلی کو کھاک

کر دیا، ایک روز میں دریبہ میں سے جا رہا تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فوج کی فوج
کی آرہی ہے میں بھی دیکھ کر گلاب گندھی کی دوکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آگے آگے
بینڈ والے تھے مگر وہ ایسا اندھا دھند ڈھول ٹھونک رہے تھے کہ خدا کی پناہ
پیچھے کوئی پچاس ساٹھ سوار تھے۔ مگر انکی عجیب کیفیت تھی۔ گھوڑے کیا تھے دھوبی کے
گدھے معلوم ہوتے تھے، مگر گٹھریوں کی کثرت سے جسم کا کچھ تھوڑا سا حصہ دکھائی دیتا
تھا۔ یہ گٹھریاں کیا تھیں، دہلی کی لوٹ جس بھلے آدمی کو کھاتا پیتا دیکھا اسکے کپڑے
تک اتروا لئے۔ جس روپیہ پیسے والے کو دیکھا اسکے گھر پر جا کر ڈھئی دیدی اور کہا
چل ہمارے ساتھ قلعہ کو تو انگریزوں سے ملا ہوا ہے۔ جبتک کچھ رکھوا نہ لیا
اسکا پنڈا نہ چھوڑا۔ اگر دہلی کے چاروں طرف انگریزی فوج کا محاصرہ نہ ہوتا تو
شریف لوگ کبھی کے دہلی سے نکل گئے ہوتے۔ غرض خدائی فوجداروں کا یہ لشکر غل مچاتا
دین دین کے نعرے مارتا میرے سامنے سے گذرا۔ اس جم غفیر کے بیچوں بیچ دولھا میاں
تھے یہ کون تھے؟ عالیجناب بہادر خانصاحب سپہ سالار۔ لباس سے بجائے سپہ سالار کے
دولھا معلوم ہوتے تھے۔ جڑاؤ زیور میں لدے ہوئے تھے۔ پہنتے وقت شاید یہ بھی معلوم
کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی کہ کون سا مردانہ زیور ہے اور کون سا زنانہ۔ صافے پر
بجائے طرے کے سراسری لگائی تھی، جیسے خود زیور سے آراستہ تھے اسی طرح ان کا
گھوڑا بھی زیور میں لدا ہوا تھا۔ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جاتے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ
نعوذ باللہ خدا کی خدائی اب ان ہی کے ہاتھ آگئی ہے، گلاب گندھی نے جوان لٹیروں
کو آتے دیکھا چپکے سے دوکان بند کر دی اور اندر دراڑوں سے بیٹھا جھانکتا رہا۔ خدا
معلوم کیا اتفاق ہوا کہ بہادر خاں کا گھوڑا عین اسکی دوکان کے سامنے اکڑ کر رکا، بہادر خاں
نے ادھر ادھر گردن پھیری۔ پوچھا یہ "کس کی دوکان ہے" انکے ایڈیکانگ نے عرض
کی کہ گلاب گندھی کی، فرمایا اس بدمعاش کو خبر نہیں کہ ما بدولت ادھر سے گذر رہے

ہیں دوکان بند کرنے کے کیا معنی، ابھی کھلواؤ، خبر نہیں کہ اس حکم قضا شیم کا بیچارے لالہ جی پر اندر کیا اثر ہوا۔ ہم لپنے تو یہ دیکھا کہ ایک سپاہی نے تلوار کا دستہ کواڑ پر مار کر کہا کہ دروازہ کھولو، اور جس طرح "سمسم کھل جا" کے الفاظ سے علی بابا کے قصے میں چوروں کے خزانے کا دروازہ کھلتا تھا اسی طرح اس حکم محکم سے گلاب گندھی کی دوکان کھل گئی۔ بجنسہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تماشے کا پردہ اٹھ گیا۔ دروازہ کے بیچوں بیچ لالہ جی ہانپتے کانپتے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے کچھ بولنا چاہتے تھے، مگر زبان یاری نہ دیتی تھی، اسوقت بہادر خاں کچھ خوش خوش تھے، کسی موٹی اسامی کو مار کر آئے ہوں گے کہنے لگے تمہاری ہی دوکان سے بادشاہ کے ہاں عطر جاتا ہے؟ لالہ جی نے بڑے زور سے گردن کی ٹوٹی ہوئی گڑیا کی طرح جھٹکا دیا، حکم ہوا کہ جو عطر بہتر سے بہتر ہو وہ حاضر کرو۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اندر گئے اور دو کنٹر عطر سے بھرے ہوئے حاضر کئے معلوم نہیں بیس روپے تولہ کا عطر تھا یا تیس روپے تولہ کا بہادر خاں نے دونوں کنٹر لئے کاگ نکالنے کی تکلیف کون گوارا کرتا۔ ایک کی گردن دوسرے سے ٹکرا دی۔ دونوں گردنیں کھٹ سے ٹوٹ گئیں، عطر سونگھا، کچھ پسند آیا، ایک کنٹر گھوڑے کی ایال پر الٹ دیا اور دوسرا ادھر پر، کنٹر پھینیاک حکم دیا گیا "فارورڈ" اس طرح بچارے گلاب گندھی کا سینکڑوں روپے کا نقصان کر کے یہ ہندوستان کو آزادی دلانے والے چل دیئے، ادھر اس خدائی فوجدار کا جانا، ادھر ہم لونڈوں کا تالیاں بجانا بیچارے لالہ جی نے کھسیانے ہو کر دوکان بند کر دی، کبھی غدر کے طوفان بےتمیزی میں نقصان تو جو ہونا تھا وہ ہوا مگر کالج کی دوربین توڑ کر جو نقصان اس بےسری فوج نے ملک کو پہنچایا۔ اسکی تلافی ناممکن ہے۔ کالج میں پرنسپل صاحب کے کمرے کے اوپر ایک بڑی زبردست دوربین نصب تھی، پرنسپل صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ دوربین کالج کے ایک بڑے دلدادہ انگریز نے کالج کے نذر کی ہے۔ اسکا سامنے کا شیشہ بڑی دقت

سے تیار ہوا تھا، اس انگریز کے خاندان والوں نے برسوں میں اسے گھس کر پتلا اور اتنا پتلا کیا تھا کہ کاغذ سے بھی باریک ہوگیا تھا۔ غرض یہ کہ دوربین کالج کا سرمایہ ناز تھی، دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوٹھے پر ایک بڑی توپ لگی ہوئی ہے، غدر کے زمانہ میں کسی بدمعاش کی اس پر بھی نظر پڑ گئی، اس نے جاکر فوج میں اُڑا دیا کہ انگریزوں نے راتوں رات کشمیری دروازہ سے آکر کالج کے اوپر توپ لگادی ہے اور اب تھوڑی دیر میں قلعہ اڑا دیں گے، یہ سننا تھا کہ ساری فوج کالج پر چڑھ آئی، سیڑھیاں لگا سیکڑوں سپاہی چھت پر پہنچ گئے۔ ایک کندہ ناتراش نے بندوق کا کندہ سامنے کے شیشے پر مارا، چھن سے شیشہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور ایک خاندان کی پچاس ساٹھ برس کی محنت خاک میں مل گئی، ان نابکاروں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، دوربین اٹھا نیچے پھینک دی، اور چند ہی منٹ میں دین دین کے نعروں میں اس یادگار سلف کا ان ناخلفوں کے ہاتھوں خاتمہ بالخیر ہوگیا،

غدر کے ہزاروں واقعات مولوی صاحب سے سنے ہیں، لیکن اکثر تو ایسے ہیں کہ ان کا موجودہ زمانہ میں دہرانا خطرناک ہے، اور بعض ایسے ہیں کہ وہ پوری طرح یاد نہیں رہے، ہم بی۔ اے میں پڑھتے تھے کہ کیمبرج سے غدر کے متعلق ایک جواب مضمون پر انعام مقرر ہوا۔ اس مضمون کے لئے شرط یہ قائم کی گئی تھی کہ کوئی واقعہ تاریخی کتاب سے نہ لیا جائے۔ جو کچھ لکھا جائے شہر کے بڈھے بڑھیوں سے دریافت کرکے لکھا جائے۔ میں نے بھی مضمون لکھا تھا اور مجھ ہی کو یہ انعام ملا، میں نے اس مضمون میں، ایک باب مولوی صاحب کے بیان کردہ قصوں کے لئے مخصوص کر دیا تھا، میں کرید کرید کر مولوی صاحب سے اس مضمون کے لئے واقعات دریافت کیا کرتا اور وہ خوشی خوشی بتاتے اب وہ مضمون دریا برد نہیں تو دریا پار ضرور ہوگیا، مسودہ نہ رکھا اور نہ رکھنے کی عادت ہے، اس لئے اب اس کا ذکر کرنا ہی فضول ہے۔

آپ ہمارے پڑھنے کا طریقہ تو سن چکے، اب مولویوں کی جماعت کا حال بھی سن لیجئے
اس جماعت میں تمام کے تمام سرحد پار ہی کے لوگ تھے۔ لمبے لمبے کرتے بڑی بڑی آستینیں
ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو تھان کی شلواریں، شملہ بقدار علم کے لحاظ سے کئی کئی سیر کے پگڑ،
لمبی لمبی داڑھیاں، غرض معلوم ہوتا تھا کہ افغانستان کا کوئی قطعہ اٹھا کر تماشوں کی
گلی میں رکھ دیا گیا ہے، محنت کی یہ حالت کہ رات رات بھر کتاب دیکھتے، ٹھوٹھ ایسے
کہ باوجود اس محنت کے کورے کے کورے رہتے، مولوی صاحب ہم سے ہمیشہ
ان کی موٹی عقل کی تعریف کیا کرتے اور کہتے "بھائی ان ملاؤں سے عاجز آگیا ہوں
اپنا بھی وقت ضائع کرتے ہیں اور میرا بھی، جواب اس لئے نہیں دے دیتا کہ دل شکنی
ہوگی، مگر کیا کروں، اللہ میاں نے ان لوگوں کو ادب سمجھنے کا دماغ ہی نہیں دیا ہے،
ہزار سمجھاتا ہوں ان کی سمجھ میں نہیں آتا، بھلا ان کو حماسہ یا متنبّی پڑھنے کی کیا ضرورت
پڑی ہے، فوج میں نوکر ہو جائیں، محنت مزدوری کریں یا ہینگ کا توبڑا گلے میں ڈال کر
بیچتے پھریں" ہم کہتے مولوی صاحب آپ بھی غضب کرتے ہیں۔ رگڑ سے پتھر بھی گھس جاتا
ہے، آخر متنبّی نے ایسے کون سے شعر کہے ہیں جو غور کرنے سے سمجھ میں نہ آئیں، ایک روز
فرمانے لگے، لو آج تم ٹھہر جاؤ اور ان مولویوں کا رنگ بھی دیکھ لو، مگر دیکھو کہیں ہنس
نہ دینا، ورنہ چھری بھونک دیں گے" اس روز ہم کو بھی چھٹی تھی، ہم پڑھ کر فارغ ہی
ہوئے تھے کہ یہ جماعت آگئی، یہ لوگ مولوی صاحب کو گھیر کر بیٹھ گئے، اور ہم اٹھ کر
ایک کونے میں جا بیٹھے۔ اس روز مقامات حریری کا سبق تھا، کتابیں کھولی گئیں
اور ایک صاحب نے بڑی گرجتی ہوئی آواز میں آعوذ باللہ سے سبق شروع کیا۔ زید بن
حارث کے سفر کرنے کو "فی اناء اللیل" سے ادا کیا تھا، ان بھلے آدمیوں نے
رات کو قاموس دیکھ کر مطالعہ کیا تھا، اس میں شامت اعمال سے "اناء" کے
معنی "مٹکے" کے بھی ہیں، اللہ دے اور بندہ لے۔ انھوں نے یہاں مٹکا پھنسا دیا اور

نہایت متانت سے "فی اناء اللیل" کے معنی "رات کے مٹکے میں سفر کیا" سے کر دیئے"
مولوی صاحب نے فرمایا" اناء کے دوسرے معنی بھی تو ہیں"۔ پڑھنے والے نے کہا:" جی
ہاں کئی معنی ہیں، لیکن اس مقام پر مٹکا ہی زیادہ چسپاں ہوتا ہے" ہم کو ہنسی آئی،
مولوی صاحب نے مسکرا کر اور ان لوگوں نے نہایت بڑے بڑے دیدوں سے ہماری طرف
دیکھا ہم نے سوچا بھائی یہاں ہمارا ٹھکانا نہیں، یہاں سے کھسک ہی جانا مناسب ہے
کہیں کوئی اٹھ کر گلا نہ گھونٹ دے ہم نے اجازت چاہی مولوی صاحب کہتے ہی رہے
" بیٹھو ذرا اور کچھ سن جاؤ ہم نے کہا" مولوی صاحب ہم کو کام ہے۔ کسی اور دن دیکھا
جائے گا" یہ کہ جوتیاں پہن سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے، کوٹھے سے اتر جو ہنسنا شروع
کیا تو گھر پہنچتے پہنچتے بڑی مشکل سے ہنسی رکی، اب جب کبھی خیال آتا ہے تو اس جماعت
کا نقشہ آنکھوں کے نیچے پھر جاتا ہے۔ اور رات کے مٹکے میں سفر کرنے کا فقرہ ہنساتا
نہیں تو مسکراہٹ ضرور پیدا کر دیتا ہے۔

مولوی صاحب کو اپنے ترجمہ پر ناز تھا اور اکثر اس کا ذکر فخریہ لہجہ میں کیا کرتے
تھے، اردو ادب میں ان کی جن تصنیفات نے دھوم مچا دی ہے وہ ان کے نزدیک
بہت معمولی چیزیں تھیں، وہ کہا کرتے تھے کہ" میری تمام عمر کا اصلی سرمایہ کلام مجید کا ترجمہ
ہے۔ اس میں مجھے جتنی محنت اٹھانی پڑی ہے اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔
ایک ایک لفظ کے ترجمہ میں سارا سارا دن صرف ہو گیا ہے، میاں سچ کہنا کیسا محاورہ
کی جگہ محاورہ بٹھایا ہے" ہم نے کہا" مولوی صاحب بٹھایا نہیں ٹھونسا ہے، جہاں یہ
فقرہ کہا اور مولوی صاحب اچھل پڑے بڑے خفا ہوتے اور کہتے" کل کے لونڈو میرے
محاوروں کو غلط بتاتے ہو، میاں میری اردو کا سکہ تمام ہندوستان پر بیٹھا ہوا ہے
خود لکھو گے تو چیں بول جاؤ گے محاوروں کی بھرمار کے متعلق اکثر مجھ سے ان کا جھگڑا
ہوا کرتا تھا، میں ہمیشہ کہا کرتا تھا" مولوی صاحب آپ نے محاوروں کی کوئی فہرست

تیار کرلی ہے اور کسی نہ کسی محاورہ کو آپ کسی نہ کسی جگہ پھنسا دینا چاہتے ہیں، خواہ اس کی گنجائش وہاں ہو یا نہ ہو' جناب والا اہل زبان کو یہ دکھانے کی ضرورت نہیں کہ وہ محاوروں پر حاوی ہے' یہ صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم باہر والے نہیں دہلی والے ہیں' تھوڑی دیر تو حجت کرتے، اسکے بعد کہتے "اچھا بھئی تم ہی دہلی والے سہی' ہم تو اسی طرح لکھیں گے جس طرح ابتک لکھا ہے تم ہم کو دہلی والیوں کی فہرست سے نکال دو، مگر میاں اپنا ہی نقصان کرو گے۔"

مجھ کو مولوی صاحب کی طرز تحریر پر کوئی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ اول تو میرے لئے ابتدا ہی میں "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" کی سب سے بڑی ٹھوکر ہے' دوسرے میری قابلیت محدود کی سرحد سے گزر کر مفقود کی سرحد میں آگئی ہے' لیکن باوجود ان موانعات کے میں نے مولوی صاحب کے سامنے بھی کہا۔ اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا، تحریر میں ہو یا تقریر میں وہ محاوروں کی ٹھونسم ٹھانس سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے۔ اور بعض وقت ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط ہوتے تھے، خدا معلوم انھوں نے محاوروں کو کوئی فرہنگ تیار کرتی تھی یا کیا کہ ایسے ایسے محاورے ان کی زبان اور قلم سے نکل جاتے تھے جو کبھی دیکھے نہ سنے ان کی عبارت کی روانی اور بے ساختگی کا جواب دوسری جگہ ملنا مشکل ہے۔ مگر چلتے چلتے راستہ میں عربی الفاظ کے روڑے ہی نہیں بچھاتے تھے، پہاڑ رکھ دیتے تھے' غرض یہ تھی کہ لوگ یہ جان لیں کہ میں دہلی والا ہی نہیں ہوں، مولوی بھی ہوں، بہر حال ان کی تحریر کا ایک خاص رنگ ہے اور اسکی نقل اتارنا مشکل اور بہت مشکل ہو ترجمہ کرنے کا انھیں خاص ملکہ تھا، وجہ یہ تھی کہ کئی زبانوں پر حاوی تھے، اگر اس زبان کے لفظ سے مطلب ادا نہ ہوا تو دوسری زبان کا لفظ وہاں رکھ دیا۔ مثال کے

طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

۱۹۰۳ء کے دربار تاجپوشی پر جو انگریزی کتاب لکھی گئی تھی اسکا ترجمہ مولوی صاحب کے سپرد ہوا۔ ایک روز جو ہم پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ خوبصورت سی جلد کی ایک بڑی موٹی کتاب مولوی صاحب کی میز پر رکھی ہے۔ ہم نے اجازت لے کر کتاب اٹھائی اور اول سے آخر تک ساری تصویریں دیکھ ڈالیں، اول تو مولوی صاحب بیٹھے دیکھتے رہے، پھر کہنے لگے "بیٹا یوں سرسری نظر سے کیا دیکھتے ہو گھر لے جاؤ، اچھی طرح پڑھو، مگر دیکھو خراب نہ کرنا۔" ہم دونوں نے دل میں سوچا کہ خدا معلوم یہ کیا بھید ہے جو مولوی صاحب بغیر مانگے اپنی کتاب دے رہے ہیں خوش خوش کتاب بغل میں مار گھر آئے، دو ایک روز میں پڑھ ڈالا، ایک آدھ تصویر غائب کر دی، چوتھے روز کتاب لے جا مولوی صاحب کے حوالہ کی۔ پوچھا "کہو پسند آئی" ہم نے کہا "مولوی صاحب خوب کتاب ہے۔" کہنے لگے "اچھی کتاب ہے تو ترجمہ کر ڈالو" ہم نے کورا جواب دیدیا۔ کہا دیکھو، سنو، اس کتاب کا مجھے ترجمہ کرانا ہے، تم سے ترجمہ کراؤں گا، صحیح میں کر دوں گا۔ اب مجھ میں اتنا دم نہیں کہ اتنی بڑی کتاب کا ترجمہ کر سکوں، اگر آپ نے انکار کیا تو کل سے گھر میں گھسنے نہ دوں گا یہ کہتے کہتے کتاب کی جلد توڑ دس صفحے میرے اور دس میاں دانی کے حوالہ کر دئے ساتھ ہی میاں رحیم بخش کو آواز دی اور وہ آئے اور انکو حکم دیا کہ ایک ایک دستہ بادامی کاغذ کا ان دونوں کو دیدو، قہر درویش بر جان درویش کی صورت تھی، جس طرح پہلے خوشی خوشی پوری کتاب لے گئے اسی طرح منھ بنائے ہوئے ان پلندوں کو بغل میں مارا، گھر آ کر بیگار کے کام کی طرح ترجمہ کیا، دوسرے روز جا کر پڑھنے کے لئے کتاب اٹھائی پوچھا "ترجمہ لائے" ہم نے دبی ہوئی آواز میں کہا "لائے" کہا "پہلے وہ پڑھو" ہم پڑھتے جاتے اور مولوی صاحب اصل کتاب دیکھ کر اسکی درستی کرتے جاتے اب اگر میں یا میاں دانی کہیں یہ ترجمہ ہمارا ہے تو یقین مانئے کہ دونوں جھوٹے ہیں۔ مولوی صاحب کی اصلاح نے

ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم نے سمجھ لیا کہ اس علم میں بھی مولوی صاحب سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسکے بعد سے ہمیں ترجمہ کا شوق ہو گیا اور تھوڑے ہی دنوں میں کتاب ختم ہو گئی۔ اسکے چھپنے کے بعد ہمارے مولوی صاحب سے بڑی جنگ ہوئی۔ کیونکہ بندہ خدا نے ہم دونوں غریبوں کا اس میں ذرا بھی ذکر نہیں کیا، مگر کچھ پروا نہیں، اسکا بدلہ ہم اب لئے لیتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں کہ اس کتاب میں تھوڑے بہت لفظ ہم دونوں کے بھی ہیں، یہ ضرور ہے کہ اگر اصلاح شدہ مسودوں کو دیکھا جائے تو کانٹ چھانٹ کی وجہ سے ہمارے لفظوں کا تلاش کرنا سر میں لیکھیں دیکھنے سے کم مشکل نہ ہوگا۔ ہاں، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مولوی صاحب چونکہ کئی زبانوں پر حاوی تھے۔ اس لئے ان کو کہیں نہ کہیں سے مناسب الفاظ ادائے مطلب کے لئے ضرور مل جاتا تھا۔ مثلاً اسی جشن تاجپوشی کی کتاب میں ایک جگہ (STALLION) آیا۔ ڈکشنری میں جو دیکھا تو اسکے معنی "سیاہ بڑا جنگی گھوڑا" نکلے یاروں نے ترجمہ میں وہی الفاظ ٹھونک دیئے۔ جب مولوی صاحب نے یہ الفاظ سنے تو بہت ہنسے کہنے لگے "واہ بیٹا، واہ۔ کیوں نہ ہو دلی والے ہو، خالص اردو لکھی ہے، بندۂ خدا "شبدیز" لکھ دو چلو چھٹی ہوئی" اب کوئی صاحب اس سے بہتر لفظ بتا دیں تو میں جانوں انکے ترجمہ میں خوبی یہ ہوتی تھی کہ لفظ کی جگہ لفظ بٹھاتے تھے لیکن وہ ایسا ہوتا تھا کہ وہاں نگینہ بن جاتا تھا۔ تعزیرات ہند کا ترجمہ اٹھا کر دیکھو وہی لفظ پر لفظ معنی بھی پورے دیتا ہے اور اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا، سیکڑوں کتابوں کے ترجمے ہوئے، دوسری اشاعت میں کچھ اور تیسری میں کچھ کے کچھ ہو گئے لیکن تعزیرات ہند کا ترجمہ بھی میرا ایک کارنامہ ہے۔ اس کتاب کے ترجمے کا کام تین آدمیوں کے سپرد ہوا تھا، ان میں ایک مولوی عظمت اللہ صاحب انکی اصلاح ڈائرکٹر صاحب کے ذمہ تھی، اور ہم ڈائرکٹر صاحب کے سرشتہ دار تھے۔ روزانہ ایک دو دفعات کا ترجمہ آتا۔ ہم ڈائرکٹر صاحب کو سناتے" وہ بڑا غل مچاتے کہ یہ لفظ خلاف محاورہ ہے۔ اس لفظ سے مفہوم

ادا نہیں ہوتا، یہ لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا گیا ہے۔ غرض دو تین دفعات کہیں تین چار گھنٹے میں پاس ہوتیں، مجھے بڑا تاؤ آتا تھا کہ ترجمہ کرے کوئی یہ باتیں سنے کوئی، مگر بھئی یہ ضرور کہوں گا۔ کہ وہ بھلا جو بات کہتا تھا یا دن تولے یا رتی کی کہتا تھا۔ جو اعتراض کرتا تھا وہ اٹھائے نہ اٹھتا تھا۔ میاں پرانے زمانے کے انگریز غضب کی اردو سمجھتے تھے۔ گو اچھی اردو لکھ نہ سکیں، مگر ترجمہ کی وہ غلطیاں نکالتے تھے کہ تم جیسے دہلی والوں کے کان پکڑوا دیں، میں نے بھی ترجمہ دیکھا تو واقعی کچھ اکھڑا اکھڑا معلوم ہوتا، میں نے دل میں کہا کہ نذیر احمد صاحب تو بھی خم ٹھونک کر میدان میں کیوں نہیں آجاتا اردو جانتا ہے، فارسی جانتا ہے، عربی جانتا ہے، کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی سمجھتا ہے ان لوگوں سے اچھا نہیں تو کم سے کم ایسا ترجمہ تو بھی کرلے گا۔ یہ سوچ سوا روپیہ کی رائل ڈکشنری بازار سے خرید لایا، رات کو لیمپ جلا، کپڑے اتار، لنگوٹ باندھ ترجمہ پر پل پڑا، جن دفعات کا ترجمہ دوسرے روز پیش ہونے والا تھا ان کا ترجمہ خود کر ڈالا۔ دوسرے دن ترجمہ جیب میں ڈال دفتر پہونچا۔ ڈائرکٹر صاحب آئے مجھے بلایا اور ان لوگوں کے ترجمہ کو سن کر وہی گڑبڑ شروع کی۔ خدا خدا کرکے یہ مشکل آسان ہوئی۔ میں نے کہا کہ کمترین بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہے، کہا اچھا کہو۔ میں نے جیب میں سے کاغذ نکالا وہ سمجھے عرضی ہے لینے کو ہاتھ بڑھایا میں نے کہا "عرضی نہیں ہے، آج کی دفعات کا ترجمہ میں نے کیا ہے۔" ڈائرکٹر صاحب یہ سن کر اچھل پڑے کہنے لگے "تم نے ترجمہ کیا ہے؟" "تم کو تو انگریزی نہیں آتی پھر ترجمہ کیسے کیا؟" میں نے کہا "رائل ڈکشنری سے" انھوں نے ہنس کر کہا۔ "تعزیرات کا ترجمہ رائل ڈکشنری سے نہیں ہوا کرتا۔ میں نے کہا "سن تو لیجئے" کہا "اچھا سناؤ" میں نے جو پڑھا تو صاحب بہادر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، کہنے لگے "یہ ترجمہ تم نے رائل ڈکشنری سے کیا ہے،" میں نے کہا "ہاں" کہنے لگے کل شروع کی چار دفعات ترجمہ کرکے لاؤ میں دوسرے دن لے کر گیا۔ بہت پسند کیا اور کہا "تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہا

کہیں ترجمہ کر سکتا ہوں جو میرا اتنا وقت ضائع کرایا جاؤ تم بھی ان ترجمہ کرنے والوں میں شریک ہو جاؤ" اس دن سے ہم بھی پانچوں سواروں میں مل گئے، اور یہی ہماری ترقی کا زینہ تھا۔ اب رہے ہماری تصنیفات پر انعام، وہ تو اللہ میاں نے چھپر پھاڑ کر دیئے ہیں اگر کہتا بھی کہ مراۃ العروس پر تم کو انعام ملے گا تو میں اس کو دیوانہ سمجھتا، اصل یہ ہے کہ یہ کتاب میں نے اپنی لڑکی کے لئے لکھی تھی، وہی پڑھا کرتی تھی۔ میاں بشیر کو "چند پند" لکھ دی تھی۔ میں اس زمانہ میں تعلیمات کا انسپکٹر تھا، دورے پر نکلے تھے، بال بچے ساتھ تھے، ایک جگہ ٹھہرے تھے کہ مسٹر کیمپ سن ڈائرکٹر تعلیمات کا ڈیرہ بھی قریب آلگا۔ شام کا وقت تھا۔ میاں بشیر اپنی ٹٹوانی پر سوار ہو کر ہوا خوری کو نکلے ادھر ڈائرکٹر صاحب آرہے تھے، میاں بشیر نے جھک کر سلام کیا۔ صاحب ٹھہر گئے، پوچھا "میاں تمہارا کیا نام ہے" انھوں نے نام بتایا۔ پھر پوچھا تمہارے والد کون ہیں" انھوں نے میرا نام بتایا۔ پھر پوچھا "کہو میاں کیا پڑھتے ہو"۔ انھوں نے کہا "چند پند" نام سنکر پریشان ہوئے۔ کیونکہ اس عجیب و غریب نام سے ان کے کان نا آشنا تھے کہا ہمیں اپنی کتاب دکھاؤ گے، بشیر نے کہا۔ جی ہاں ابھی لاتا ہوں، ہماری آپا کی بھی کتاب دیکھئے گا" انھوں نے کہا" اس کتاب کا نام کیا ہے؟ انھوں نے کہا" مراۃ العروس" یہ دوسرا نیا نام تھا صاحب نے کہا ہاں وہ بھی لاؤ میاں بشیر ٹٹوانی سے کود بھاگتے ہوئے ڈیرے میں آئے اپنا جزدان کھول "چند پند" نکالی اسکے بعد اپنی بہن کے جزدان پر قبضہ کیا، اس نے جو دیکھا کہ بشیر جزدان ٹٹول رہا ہے تو دوڑتی ہوئی گئی۔ اتنے میں بشیر مراۃ العروس لیکر بھاگا، یہ اسکے پیچھے بھاگی دونوں میں بڑی دھینگا مشتی ہوئی خوب رونا پیٹنا ہوا، بشیر بہن کو دھکا دے کتاب لے یہ جا وہ جا، بہن صاحب نے دل کا بخار آنسو بہا کر نکالا، میاں بشیر نے دونوں لے جا صاحب کے حوالہ کیں انھوں نے الٹ پلٹ کر کچھ پڑھا اور بشیر سے کہا" ہم یہ کتابیں لے جائیں گے، کل بھجوا دیں گے، انھوں نے کہا

لے جائیے، کل ہم کو چھٹی رہے گی۔" میں جو ڈیرے میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قیامت مچ رہی ہے، لڑکی نے رو رو کر آنکھیں لال کر لی ہیں، میاں بشیر ڈرے سہمے ڈیرے کے ایک کونے میں دبکے بیٹھے ہیں میرا اندر قدم رکھنا تھا کہ فریاد کی صدا بلند ہوئی صاحبزادی نے رو رو کر اس طرح واقعہ بیان کیا جس طرح کسی عزیز کے مرنے کا کوئی بین کرتا ہے۔ میں نے بشیر کو بلایا وہ ڈرے کہ کہیں ٹھکائی نہ ہو جائے۔ پہلے ہی سے بسورنا شروع کیا۔ وہ دبے جاتے تھے اور بہن شیر ہوئی جاتی تھی آخر بڑی مشکل سے اتنا معلوم ہوا کہ ایک انگریز دونوں کتابیں لے کر چلا گیا، میں نے جا کر سائیس سے پوچھا کہ وہ انگریز کون تھا، تو معلوم ہوا کہ سامنے جو ڈیرے میں پڑے ہیں ان میں وہ اترے ہیں، مجھے بڑا تعجب ہوا کہ بھلا ڈائرکٹر صاحب کو بچوں کی کتابوں سے کام کیا۔ خیر لڑکی کو دلاسا دیا کہ میں لا دونگا نہیں تو دوسری ہی لکھ دونگا۔ اس نے کہا کہ میں لونگی تو وہی کتاب لوں گی، بڑی مشکل سے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا اب فکر ہوا کہ صاحب سے پوچھوں تو کیونکر پوچھوں سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ صاحب کا مطلب اس طرح بچوں کی کتابیں منگوانے سے کیا ہو سکتا ہے، غرض اسی شش و پنج میں صبح ہو گئی کوئی سات بجے ہوں گے کہ صاحب کا چپراسی آیا اور کہا کہ صاحب سلام بولتے ہیں وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحب بیٹھے مراۃ العروس پڑھ رہے ہیں، سلام کر کے کرسی پر بیٹھ گیا" صاحب نے کہا، "مولوی صاحب آپ نے ایسی مفید اور دلچسپ کتابیں لکھیں اور طبع نہ کرائیں اگر کل آپ کا لڑکا مجھ کو نہ ملتا تو شاید کوئی بھی ان کتابوں کو نہ دیکھتا تو چند ہی روز میں بچوں کے ہاتھوں یہ کتابیں پھٹ پھٹا کر برابر ہو جاتیں اگر آپ اجازت دیں تو میں مراۃ العروس کو سرکار میں پیش کر دوں۔ آجکل گورنمنٹ ایسی کتابوں کی تلاش میں ہے جو لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں داخل ہو سکیں، میں نے کہا، "آپ کو اختیار ہے" یہ کہہ کر میں چلا آیا، صاحب نے وہ کتاب گورنمنٹ میں پیش کر دی، وہاں سے انعام ملا، یہاں شیر کے منھ کو خون لگ گیا

اوپر تلے کئی کتابیں گھسیٹ ڈالیں، جو کتاب لکھی اس پر انعام ملا جو لکھا پسند کیا گیا۔ غرض وہ مصنف بھی بن گئے۔ اور ساتھ ہی، ڈپٹی کلکٹر بھی ہو گئے۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ انسان کا عہدہ جتنا بڑھتا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کی فرصت کا وقت بھی گھٹتا جاتا ہے۔ یہی مصیبت ہم پر پڑی ادھر کام کی زیادتی، ادھر سر سید کی فرمائشوں کی بھرمار آج یہاں لکچر دیا، کل وہاں دیا، تصنیف کا سلسلہ ہی ٹوٹ گیا، خدا خدا کر کے بڑھاپے میں فرصت ملی تو قرآن شریف حفظ کر لیا، اس کے ساتھ ہی یہ شوق ہوا کہ اس کا ترجمہ بھی کر لو، لوگوں کو بھی مفید ہوگا، اور شاید تمہاری نجات کا بھی ذریعہ ہو جائے غرض جتنی محنت ممکن تھی اتنی محنت کی اس ترجمہ کے سلسلے میں "الحقوق والفرائض" مواد بھی جمع کر لیا، کلام مجید کی دعاؤں کو بھی ایک جگہ اکٹھا کر لیا۔ غرض ایک نتیجہ اور کئی کاج ہو گئے۔ مگر بھئی سچ کہنا کیسا ترجمہ کیا ہے" میں تو خاموش رہا مگر دانی نے کہا کہ مولوی صاحب ہم کو اس ترجمے کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ مولوی صاحب نے کہا، ہیں میاں دانی! یہ کیا کہا، تم نے ابھی تک میرا ترجمہ نہیں دیکھا، بھئی غضب کیا، ارے میاں رحیم بخش ذرا ادھر تو آنا، وہ جو سنہری جلد کی حمائل شریف ہے۔ وہ میاں دانی کو دیدو، بیٹا ذرا اس کو غور سے پڑھو دیکھو تو میں نے اس بڑھاپے میں کیا محنت کی ہے"۔ غرض حمائل شریف میاں دانی کے قبضہ میں آگئی انھوں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ آپ کی یادگار رہے گی، جب ہم اٹھ کر چلنے لگے تو مولوی صاحب نے دانی سے کہا۔" ارے بھئی ایک بات تو کہنی بھول گیا، اس حمائل شریف کا ہدیہ ساڑھے پانچ روپیہ ہے۔ کل ضرور لیتے آنا۔ بچارے کا شکریہ اکارت گیا اور دوسرے دن ساڑھے پانچ روپیہ مولوی صاحب نے دھروا لئے۔

مولوی صاحب نے کئی مرتبہ اس عاجز پر بھی رقمی حملے کئے، لیکن یہ ذرا ٹیڑھا مقابلہ تھا۔ ایک چھوڑ کئی کتابیں مولوی صاحب سے اینٹھیں۔ کبھی ایک پیسہ نہ دیا نہ ہیں گیا

خدانخواستہ وعدہ کرتا اور رقم نہ دیتا۔ میں اسوقت تک کتاب لیناہی نہ تھا جبتک مولوی صاحب خود نہ فرمادیتے کہ "اچھا بھئی" تو یونہی لے جا، مگر میرا پیچھا چھوڑ"۔ میری ترکیب یہ تھی کہ پہلے کتاب پر قبضہ کرتا، مولوی صاحب قیمت مانگتے، میں حجت کرتا، وہ جواب دیتے میں اس کا جواب دیتا۔ غرض بہت کچھ جھک جھک کے بعد تھک کر کہتے کہ جاؤ میں نے قیمت معاف کردی آئندہ میری کسی کتاب کو ہاتھ لگایا تو اچھا نہ ہوگا، مگر خدا غریق رحمت کرے۔ کوئی کتاب مجھ کو دے دیتے تھے اور جان جان کر جھگڑتے تھے، ریویو کے لئے جو کتابیں آتیں وہ تو ہمارے باپ دادا کا مال تھیں، وہ پورا ریویو لکھنے بھی نہ پاتے کہ کتاب کے صفحہ اول پر میرا نام درج ہو کر شہادت دستاویزی اور ثبوت قبضہ کی شکل اختیار کرتا اسوقت بھی پاس اس زمانے کی بعض کتابیں موجود ہیں، معلوم نہیں کہ میاں دانی کو جو حمائل شریف عطا ہوئی تھی وہ ان کے پاس رہی یا نہیں، کتابیں تو کتابیں میں نے مولوی صاحب کی ایل ایل ڈی کی گون پر قبضہ کرنے کا فکر کیا تھا۔ ہوا یہ کہ جب میں اور دانی بی۔ اے میں پاس ہوئے تو جلسہ تقسیم اسناد کے لئے لاہور جانا پڑا، گون بنوانا بے ضرورت سمجھا گیا۔ اب خیال ہوا کہ گون کس کی چھینیں۔ دانی کو تو گون مل گئی، میں نے مولوی صاحب کی گون تاکی، ہم دونوں مل کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اپنی ضرورت کا اظہار کیا۔ "بیٹا! میری گون بڑی قیمتی ہے، ساڑھے چھ سو روپے میں دو گونیں پڑی ہیں، بھلا کیا خریدتا، یہ میاں مشرف نے میرے سر منڈھ دیں، وہ ایڈنبرا میں پڑھتے تھے مجھے لکھا کہ اپنی تصنیفات و تالیفات کی نہایت عمدہ جلدیں بندھوا کر بھجوا دیجئے۔ سر ولیم میور دیکھنا چاہتے ہیں سر ولیم میور پہلے ممالک مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر تھے، مجھ پر بھی بہت مہربان تھے میں نے مشرف کے لکھے کو سچ جانا، کتابوں کو جلد بندھوا ایڈنبرا روانہ کردیں ان کتابوں میں

میرا کلام مجید کا ترجمہ تھا وہ بہت پسند کیا گیا۔ سر ولیم میور نے یہ کتابیں ایڈنبرا یونیورسٹی میں پیش کر دیں، اور ہمیں گھر بیٹھے ایل ایل ڈی کی ڈگری مل گئی، مگر اس ڈگری کی اطلاع میرے پاس بعد میں آئی، پہلے ایک درزی کا خط اور بل آیا کہ مسٹر مشرف کی فرمائش کے بموجب ایل ایل ڈی کی ایک سیاہ اور ایک سرخ گون مع ٹوپی کے روانہ کی گئی ہے۔ براہ کرم جس قدر جلد ممکن ہو ساڑھے چھ سو روپیہ روانہ فرمائیے میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ یا تو مشرف دیوانہ ہو گیا ہے یا یہ درزی پاگل ہے کہ بیٹھے بٹھائے بل روانہ کر رہا ہے، یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گون کا پلندا بھی آ گیا غرض اسی ششش و پنج میں ایک ہفتہ گذر گیا، دوسری ڈاک سے ایل ایل ڈی کی ڈگری ملنے کا مراسلہ اور میاں مشرف کا خط ملا قہر درویش بر جان درویش، درزی صاحب کو رقم روانہ کی مشرف کو برا بھلا لکھا کہ وہاں سے یہ بھیلے بنوا کر بھجوانے کی کیا ضرورت تھی میں یہاں اپنے ناپ کی گون بنوا لیتا بہر حال یہ گون میں ساڑھے چھ سو روپے کی ہیں معاف کیجئے، نہیں دے سکتا، جا کسی پروفیسر کی گون چھین کر کیوں نہیں لے جاتا جو میرے پیچھے پڑا ہے میں یہ قصہ چپکا بیٹھا سنتا رہا، اس کے بعد کچھ کہے سنے اٹھا اور مولوی صاحب کے سامان کی کوٹھڑی کا رخ کیا۔ وہ "ہاں ہاں" کہتے ہی رہے میں نے کنڈی کھول اندر گھس الماری میں سے کالی گون نکال ہی لی، جب مولوی صاحب نے دیکھا کہ پانی سر سے گذر گیا تو سنبھل سنبھلا کر اٹھے، میں اتنی دیر میں دروازہ بند کر گون بغل میں مار پھر اپنی جگہ آ گیا مولوی صاحب بھی بیٹھ گئے، اور اب انہوں نے گون کی قیمت، میری لاپروائی ریل میں چوری کے خطرات، بی۔ اے اور ایل۔ ڈی کی گون کے اختلاف غرض اسیطرح بیسیوں چیزوں پر لکچر دے ڈالے مگر میں بیٹھا سنتا رہا۔ جب وہ کہتے کہتے تھک گئے تو میں نے لکچر شروع کیا، استادوں کی غیبت، اپنی غربت، گون کی صرف ایک روز کی ضرورت، وقت کی قلت، غرض دس بارہ پہلوؤں پر میں نے بھی اسپیچ دیدی اور

آخر میں صاف کہہ دیا کہ یہ گون میں لے کر جاؤں گا، اور ضرور لے کر جاؤں گا اس کے بعد مولوی صاحب کچھ نرم پڑے، کہنے لگے واپس کب کروگے، میں نے کہا آپ "سرخ گون پہنتے ہیں، کالی گون مجھے دیدیجئے، آپ کا کچھ نقصان نہ ہوگا اور ایک غریب کا فائدہ ہو جائیگا۔ مولوی صاحب نے کہا "نہیں بیٹا لاہور سے آکر دیدیجیو، مجھے، دربار وغیرہ میں یہ گون بھی پہننی پڑتی ہے یہ الفاظ انہوں نے کچھ ایسے لہجے میں کہے کہ مجھے بھی وعدہ کرتے ہی بن پڑی، آخر میں گون لے کر گیا اور لاہور سے آکر واپس کر دی، جب مولوی صاحب نے گون پر قبضہ کر لیا، اس وقت بہت خفا ہوئے کہنے لگے اب کے تو اگر میری کوٹھری میں گھسا تو اچھا ہی نہ ہوگا، کل کو میرا کیش بکس اٹھا کر لے جائیگا خیر وائی گون لے جاتا تو کچھ ہرج نہ تھا، کیونکہ واپسی کی تو امید رہتی، مجھے کب امید تھی آپ بزرگ واپس بھی کریں گے وہ تو کھو میرا حلال کا مال تھا، جو واپس آگیا۔" میں نے کہا "مولوی صاحب اگر پہلے سے معلوم ہو جاتا کہ آپ کو گون کی واپسی کی توقع نہیں ہے تو آپ اس کی تمام عمر شکل بھی نہ دیکھتے، ہنس کر کہنے لگے "جامشتے بعد از جنگ کی صورت ہے آئندہ میں دینے میں احتیاط کروں گا۔ اور تم واپسی میں احتیاط کرنا اس وقت تو یہ باتیں ہنسی میں ہوئیں، مگر اب افسوس ہوتا ہے، گون اگر میرے پاس رہ جاتی تو مولوی صاحب کی یادگار ہوتی، کیا ممکن ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ وہ گون میرے پاس بھیج دے۔ کیونکہ اس میں میرا بھی حق ہے، یہ ضرور ہے کہ وہ گون مولوی صاحب نے مجھ کو دی تو نہ تھی لیکن وہ سمجھ چکے تھے، یہ میرے ہاتھ سے گئی میری غلطی تھی جو اس کو لے جا کر واپس کیا۔ اب اگر مل گئی تو کبھی ایسی غلطی نہ کروں گا۔

جس طرح مسٹر مشرف نے یہ گونیں مولوی صاحب کے گلے منڈھی تھیں، اسیطرح نواب محسن الملک نے حیدرآباد میں فرنیچر ان کے سر چپک دیا تھا۔ اس زمانہ میں حیدرآباد میں نواب محسن الملک کا طوطی بول رہا تھا، ان کی تجویز اور سرسید کی تحریک پر

مولوی صاحب حیدرآباد آئے، پہلے نواب محسن الملک ہی کے ہاں قیام کیا، اس کے بعد علیحدہ کوٹھی میں جا رہے۔ ہندوستانی وضع کا سامان تخت چوکیاں وغیرہ خرید لیں، بھلا محسن الملک یہ کیونکر دیکھ سکتے تھے کہ ان کا دوست پرانی وضع کے لوگوں کی طرح زندگی بسر کرے، ایک روز سکندرآباد جا ایلین اینڈ کمپنی کو کئی ہزار کے فرنیچر کا آرڈر دیدیا اور کہدیا کہ مولوی صاحب کے ہاں پہنچادو، اور بل بنا کر بھیجدو، ایک روز جو مولوی صاحب اٹھتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ چھکڑے پر چھکڑا فرنیچر کا لدا کوٹھی کے باہر کھڑا ہے، بہت چکرائے۔ لینے سے انکار کر دیا۔ مگر وہ نواب محسن الملک کا پڑھایا ہوا جن تھا وہ کب ماننے والا تھا۔ آخر لاچار گھر چھوڑ باہر آ بیٹھے، اور دن بھر میں مولوی صاحب کا مکان صاحب بہادر کی کوٹھی ہوگیا، مگر یہ بھی نذیر احمد صاحب تھے، کچھ ایسی چال چلے کہ جب ان کا تقرر بٹنچرو کی صدر تعلقداری پر ہوا تو وہ سب کا سب سامان بہت ہی تھوڑی کمی پر ایلین کے سر مارا، بٹنچرو وہی اپنے پرانے تخت وغیرہ لے گئے، نواب محسن الملک کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی اب آگے کی داستان بڑی دلچسپ ہے، نواب محسن الملک دورہ پر نکلے، بٹنچرو قیام کیا۔ مولوی صاحب خود کہیں دورے پر گئے ہوئے تھے، نواب صاحب نے گھر میں کہلا بھیجا کہ میں آیا ہوں۔ میرے قیام کا انتظام کر دو، ایک کمرہ جس میں دو تین کرسیاں ایک دو میزیں تھیں کھولدیا گیا۔ وہ ایلین والے فرنیچر کی تلاش میں تھے، سمجھے کہ مولوی صاحب نے اپنے کمرے میں سجا کر رکھا ہوگا اندر کہلا بھیجا کہ میں مولوی صاحب کے کمرے میں ٹھہرونگا پہلے تو جواب ملا کہ وہاں آپ کو تکلیف ہوگی، مگر جب ادھر سے اصرار ہوا تو وہ کمرہ بھی کھول دیا گیا۔ اندر جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں صفاچٹ میدان ہے، نہ دری ہے نہ چاندنی نہ میز ہے نہ کرسی، کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹا سا تخت ہے اس پر ایک کمبل پڑا ہوا ہے، بازو میں ایک چوکی پر رحل اور جانماز رکھی ہے۔ کھونٹی پر کلام مجید لٹک رہا ہے۔ یہ بہت

بچوائے، لوگوں سے پوچھا وہ "فرنیچر کہاں گیا" معلوم ہوا کہ آتے آتے مولوی صاحب اسکے گوڑے کرآئے بچارے ایک رات ٹھہرے اور صبح ہی کوچ بول دیا۔

کچھ عرصے تک تو نواب محسن الملک اور ان کی بنی رہی، لبعد میں اتنی کھنچی کہ ٹوٹ گئی۔ مولوی صاحب کو یہ شکایت تھی کہ محسن الملک مجھ پر دباؤ ڈال کر کام نکالنا چاہتے ہیں محسن الملک کو یہ شکایت تھی کہ مولوی صاحب میرے مخالف ہوکر میرے اکھاڑنے کی فکر میں ہیں۔ غرض جب عماد السلطنت بہادر کا زمانہ آیا اور محسن الملک بہادر کی کمان چڑھی تو مولوی صاحب کو میدان سے ہٹ جانا ہی مناسب معلوم ہوا۔ دوسرے حیدرآباد میں صحبت کا جو رنگ تھا وہ ایسا نہ تھا جس میں مولوی صاحب کا رنگ جم سکتا۔ اس زمانے کے جو حالات مولوی صاحب بیان کیا کرتے تھے، ان کا زبان قلم پر نہ آنا ہی زیادہ مناسب ہے، لبعد میں دونوں لبظاہر ملتے جلتے تھے، لیکن موقع پڑا تو ایک دوسرے کو پردے ہی پردے میں ستائے بغیر نہ رہتے تھے ایک واقعہ تو خود میری آنکھوں کے سامنے گذرا ہے سنہ ۱۹۰۲ء کے دربار کے موقع پر کانفرنس کا اجلاس دہلی میں اجمیری دروازے کے باہر ہوا، اس زمانہ میں نواب محسن الملک علیگڈھ کالج کے سکریٹری تھے۔ کانفرنس کے صدر ہز ہائینس سر آغاخاں تھے۔ آدمیوں کی یہ کثرت تھی کہ بیٹھنے کو پنڈال میں جگہ نہ تھی، ہر جلسہ میں کئی کئی رئیس آجاتے تھے، ایک پورا دن خاص مولوی صاحب کے لکچر کے لئے مقرر ہوا تھا، مدت ہوئی تھی کہ مولوی صاحب نے پبلک میں لکچر دینا چھوڑ دیا تھا، اس روز جو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب لکچر دیں گے خلقت ٹوٹ پڑی لکچر شروع ہوا تھا کہ لارڈ کچنر نے کہلا بھیجا کہ آج میں بھی آؤں گا نواب محسن الملک نے ایسے باوقعت و ذی وجاہت مہمان کے استقبال کی تیاریاں شروع کیں، مولوی صاحب کے لکچر میں اس سے کھنڈت پڑتی تھی۔ پنڈال کے باہر گڑبڑ ہوئی اور نواب محسن الملک سمجھے کہ لارڈ کچنر آئے، اٹھ کر باہر جاتے۔ اور پھر آبیٹھتے اسی طرح وہ کوئی دس پندرہ دفعہ

باہر گئے اور اندر آئے، مولوی صاحب بہت جز بز ہوئے خفا بھی ہوئے مگر انکی کون سنتا تھا، قصہ مختصر یہ کہ لارڈ کچنر آ ہی گئے۔ نواب محسن الملک نے سب کا تعارف کرایا مولوی صاحب نے خود اپنا تعارف کرایا۔ لارڈ کچنر بیٹھنے لگے، مولوی صاحب ہم نے کورس میں آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ آج آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، اور سب سے بڑی یہ خوشی ہوئی کہ آپ کی وجہ سے ایک معمّہ حل ہوگیا۔ لارڈ کچنر نے کہا وہ کیا معمہ تھا۔ مولوی صاحب نے کہا، ہمارے ہاں قیامت کی نشانیوں میں لکھا ہے کہ اس وقت ایسا تہلکہ ہوگا۔ کہ حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ ایسی کیا مصیبت ہوگی کہ حمل گرا دے گی، مگر آج یقین آگیا کہ جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے، جب آپ کی آمد نے بڑے بڑے پیٹ والے بڈھوں کے حمل گرا دئے تو کیا تعجب ہے کہ قیامت کی آمد عورتوں کے حمل گرا دے تمام پنڈال میں سناٹا ہوگیا۔ مگر مولوی صاحب کو جو کہنا تھا کہہ گئے، اور اس طرح اپنے دل کا بخار نکال لیا۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کو وقت پر ایسی سوجھتی تھی کہ باید و شاید، چنانچہ امیر حبیب اللہ خاں کے دربار کا واقعہ دیکھ لو۔

امیر حبیب اللہ خاں بقرعید کے دن دہلی میں تھے، اس روز جمعہ تھا صبح کو بقرعید کی نماز عیدگاہ میں پڑھی اور جمعہ کی نماز جامع مسجد میں، شام کو سرکٹ ہاؤس میں دربار کیا، اس دربار میں آٹھ یا نو دہلی کے ہندو امیر اور اسی قدر مسلمان مشاہیر بلائے گئے ان میں ایک مولوی صاحب بھی تھے، سر ہنری میک موہن نے ان لوگوں کا تعارف امیر صاحب سے کرایا، جب مولوی صاحب کی باری آئی اور ان کی تعریف سر ہنری نے کی تو امیر صاحب نے کہا آپ کو ان کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں میں خود ان کی تصانیف بڑے شوق سے پڑھتا ہوں، اور تقریباً سب کا ترجمہ بھی کرا چکا ہوں دیکھنے کا اشتیاق تھا وہ آج پورا ہوگیا، اسکے بعد باتوں ہی باتوں میں پوچھا، آپ شعر بھی کہتے ہیں، مولوی صاحب نے کہا "جی ہاں کہتا ہوں" لیکن آج آپ کی تعریف میں

اپنا نہیں دوسروں کا شعر سناؤں گا، یہ کہہ کر متنبی کا یہ شعر پڑھا ؎

عید و عید و عید مجتمعاً      وجہ الحبیب ویوم العید والجمعاً

موقعہ کے لحاظ سے یہ ایسا برمحل ہوگیا کہ متنبی کو نصیب بھی نہ ہوا ہوگا۔ واقعات اور خاص کر حبیب کے لفظ نے شعر میں جان ڈال دی تمام دربار چمک اٹھا امیر حبیب اللہ خاں نے اٹھ کر مولوی صاحب کو گلے سے لگالیا، اور اتنے بوسے لئے کہ مولوی صاحب گھبرا گئے، دوسرے روز جو انھوں نے اس واقعہ کا ذکر ہم سے کیا اسکو انھیں کے الفاظ میں دہرانا اچھا معلوم ہوتا ہے کہنے لگے، بھئی میں تو شعر پڑھ کر مصیبت میں پھنس گیا شعر پڑھنا تھا کہ یہ معلوم ہوا کسی شیر نے آکر مجھے دبوچ لیا، اس میرے شیر کا کوئی سوا گز چوڑا سینہ میں ٹھہرا چھوٹے قد کا آدمی، اس نے جو بھینچ کر کھینچا تو ادھر تو ہڈیاں پلپلی ہوگئیں ادھر دم گھٹنے لگا اس کی گرفت سے نکلنے کی ہزار کوشش کرتا ہوں، جنبش تک نہیں ہوتی، قسم خدا اس وقت تک ہڈیوں میں درد ہورہا ہے' بار خدا خدا کر کے گرفت ڈھیلی ہوئی تو میں ذرا علٰحدہ ہوا ابھی پوری طرح سانس بھی نہ لینے پایا تھا کہ اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال بوسے پر بوسہ لینا شروع کیا بھلا مجھ بڈھے کو دیکھو اور امیر صاحب کی اس حرکت کو دیکھو کچھ تعریف کا یہ طریقہ افغانستان ہی میں اچھا معلوم ہوتا ہوگا، مجھے تو مارے شرم کے پسینے چھوٹ گئے، وہ اللہ کا بندہ ذرا دم لیتا اور سبحان اللہ کہکر پھر لپٹ جاتا لپٹتا اور لپٹتے ہی بوسہ پر بوسہ لینا شروع کرتا بیچارے دوسرے بھلا آدمی بیٹھے ہوئے کیا کہتے ہونگے، جب میں نے اس مصیبت سے رہائی پائی تو میری ناک سے پسینہ اس طرح بہہ رہا تھا، جس طرح کسی ٹوٹی صراحی میں سے پانی رستا ہے' نا بھائی نا ایسے درباروں کو میرا دور ہی سے سلام ہے' کون شعر پڑھ کر اپنی ہڈیاں تڑوائے' مولوی صاحب اپنی ہڈیاں سہلاتے جاتے اور یہ قصہ بیان کرتے جاتے تھے' مگر انکے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ خوشی کے مارے دل کھلا جارہا ہے اور سمجھ رہے ہیں کہ شعر کی داد اس طرح

اور اس رنگ میں آج تک نہ کسی شاعر کو ملی ہے اور نہ ملے گی'۔

اس تیزی طبع کے ساتھ صاف گوئی بھی بلا کی تھی جو کہنا ہوتا تھا وہ بغیر کہے نہ رہتے تھے' اس میں کسی لفٹنٹ گورنر پر ہی حملہ کیوں نہ ہو جائے سنہ ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرزن کا ایک لکچر ہوا اور اس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ جبتک ہندوستانی یورپ والوں کی طرح سچ بولنے کی عادت نہ ڈالیں گے اسوقت تک ہندوستان ترقی نہیں کرسکتا' اخباروں میں یہ لکچر پڑھ کر مولوی صاحب کو بڑا غصہ آیا خدا کی قدرت دیکھو کہ اسکے چند ہی روز بعد ہمارے کالج میں سالانہ جلسہ ہوا اور لارڈ لیفرائے ہندوستان کے لاٹ پادری تشریف لائے۔ شامت اعمال سے انھوں نے اپنے لکچر موضوع یہی قرار دیا۔ کالج کی طرف سے لارڈ صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لئے مولوی صاحب تجویز کئے گئے اب کیا تھا۔ اللہ دے اور بندہ لے' جو کچھ دل میں بخار بھرا تھا، خوب اچھی طرح نکال لیا، کالج والے حیران تھے کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے مولوی صاحب شکریہ ادا کر رہے ہیں یا لاٹ صاحب پر اعتراضات' مگر انھوں نے جبتک اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نہ نکال لی خاموش نہیں ہوئے سب سے پہلے انھوں نے ہندوستان کے مغربی اثر کو نہایت پر مذاق پہلو سے بیان کیا، فرمانے لگے "حضرات پائجامہ اچھا ہے یا پتلون۔ ہم پرانے آدمی تو موسم کے لحاظ سے اٹھنے بیٹھنے کی سہولت و آرام کے لحاظ سے پائجامہ ہی کو اچھا کہیں گے۔ مگر آجکل کے ہندوستانی صاحب بہادر پتلون کا ساتھ دیں گے یہ کیوں؟ اس لئے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے۔ ہم اچکن یا انگرکھے کو اچھا کہیں گے اس سے ستر ڈھکتا ہے۔ آدمی بھاری بھرکم معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے یورپ کے دلدادہ بھائی کوٹ کو پسند کریں گے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے ہم بڈھے سلیم شاہی جوتی پر جان دیں گے کیونکہ اس میں پیر کو آرام ملتا ہے' نرم نرم اور سبک ہوتی ہے ہمارے فیشن کے عاشق فل بوٹ کا انتخاب کریں گے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ انگریزوں

کا پہناوا ہے، ہمارے پاس اپنی پرانی ہر چیز کے اچھے ہونے کا ثبوت موجود ہے۔ انکے پاس صرف ایک جواب ہے کہ یورپ والے ایسا ہی پہنتے ہیں اور بھئی ہے بھی یہی بات، قسمت نے ہم کو انگریزوں کا ماتحت کر دیا ہے۔ ان کی ہر چیز ہمارے لئے قابلِ تقلید ہے اور ان کا ہر فعل ہمارے لئے چراغ ہدایت، اب افعال سے گذر کر اقوال پر نوبت آگئی ہے، پادری کرزن تھوڑے ہی دن ہوئے فرما چکے ہیں کہ ہندوستانی سچ چھوڑو اور انگریزی سچ بولا کرو، آج ہمارے پادری لیفرائے بھی ان کے ہمنوا ہوئے ہیں یا تو انھوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں کے سچ اور یورپ کے سچ میں فرق ہے اور وقت آگیا ہے کہ پاجامے کی طرح ہندوستانی سچ کو اتار پھینک دیا جائے اور پتلون کی طرح ولایتی سچ پہن لیا جائے یا انکا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے کسی مذہب نے سچ کی تلقین ہی نہیں کی ہے اور یہ نیا مال دساور ہو کر ولایت سے آیا ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو، اب تمھارے پرانے سچ کی قدر نہیں رہی ہے خدا کے لئے اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو ان لاٹ صاحبوں کا حکم مانو، یہ بڑے لوگ ہیں مولوی نذیر حسین یا پنڈت بانکے لال نہیں ہیں کہ انھوں نے ہندوستانی سچ بولنے کی ہدایت کی اور تم نے ہنس کر ٹال دیا، لاٹ صاحبوں کی بات نہ مانو گے اور ولایتی سچ نہ بولے اور یہ تازہ مال استعمال نہ کرو گے تو یاد رکھو کہ نوکری ملنی مشکل ہو جائے گی اور نوکری نہ ملی تو روٹیوں کو محتاج ہو جاؤ گے۔ کیونکہ دونوں لاٹ صاحبوں نے یہ ہدایت نہیں کی ہے کہ نوکری کا خبط چھوڑو اور تجارت یا صنعت و حرفت اختیار کرو، اسی سے تمھارے دلدر دور ہوں گے۔

آخر میں مولوی صاحب نے تھوڑا بہت لارڈ لیفرائے کا شکریہ بھی ادا کر دیا، لاٹ صاحب اردو بہت اچھی جانتے تھے، مولوی صاحب کی اس پر مذاق تقریر پہ مسکراتے رہے، مگر دل کا خدا ہی مالک تھا، کالج کے منتظمین کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، مگر یہاں تیر از کمان جستہ کی صورت تھی، کیا کر سکتے تھے، البتہ دل میں انھوں نے

ٹھان لی ہو گی۔ کہ آئندہ مولوی صاحب کو..... شکریہ ادا کرنے کی تکلیف نہ دینا ہی مناسب ہے،

اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد میں حیدر آباد چلا آیا۔ پھر دو دفعہ دہلی میں مولوی صاحب سے میرا ملنا ہوا۔ پہلی دفعہ جو ملا تو وہ زمانہ تھا کہ امہات الامہ کی وجہ سے مولوی صاحب پر بڑی لے دے ہو رہی تھی۔ میں نے بھی اسکا ذکر چھیڑا، کہنے لگے "بھئی مجھے تو اس کتاب میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی۔ جس کی وجہ سے لوگ اس طرح برانگیختہ ہو جائیں، تم نے بھی یہ کتاب دیکھی ہو گی، آخر تم ہی بتاؤ کہ اس میں میں نے کون سی ایسی نئی بات لکھی ہے" میں نے خود امہات الامہ نہیں دیکھی تھی۔ مگر میں مولوی صاحب کے طرز تحریر سے واقف تھا اس لئے میں نے یہی کہا کہ "مولوی صاحب آپکا طرز تحریر مذاق کا پہلو لئے ہوتا ہے وہ کچھ قصہ کہانیوں میں مزہ دیتا ہے، تاریخ کی کتابوں اور خاص کر مذہبی معاملات میں وہ کسی طرح کھپ نہیں سکتا، اگر لوگوں کو اعتراض ہو گا تو آپ کی طرز تحریر ہی کے متعلق ہو گا" مولوی صاحب نے کہا۔ "میرے کلام مجید کے ترجمہ کے متعلق تو یہ ادھم نہیں مچا۔" میں نے کہا اس پر بھی لوگوں کو اعتراض ہیں" مگر اس میں آپ کا معاملہ اللہ میاں سے ہے، اور یہاں انسانوں سے، مشہور مقولہ ہے کہ ؎

با خدا دیوانہ باش دبا محمد ہوشیار

کچھ سوچتے رہے پھر کہنے لگے "ہاں بیٹا کہتے تو سچ ہو" اس قسم کی تالیفات میرے دائرہ تحریر سے باہر ہیں انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں اس نقص کو رفع کر دوں گا۔"
جب میں چلنے لگا تو فرمایا، کہو بیٹا پھر ملو گے، ابھی تو تمہارے جانے میں بہت دن ہیں میں نے کہا انشاء اللہ ضرور آؤں گا۔ ہنس کر کہنے لگے انشاء اللہ کہنے کے بعد تم ضرور آئے مسلمانوں کو جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو ہزاروں قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ یہ کام میں ضرور کروں گا۔ مگر جب کسی کام کے کرنے کو جی نہیں چاہتا تو ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں

انشاءاللہ ضرور کرونگا۔ ہم تو اسکے معنی سمجھتے ہیں کہ اس کام کے کرنے کا تو ارادہ نہیں ہو ہاں اگر خدا نے چاہا اور زبردستی یہ کام کرادیا تو مجبوراً کرلیں گے۔ میں نے کہا، "مولوی صاحب آپ کو" انشاءاللہ کے یہ معنی پہنانے نہیں ہیں آپ" مذاقیہ پہلو مذہبی معاملات میں کبھی نہیں چھوڑتے"۔ کہنے لگے میاں، پہلے انشاءاللہ کے معنی دوسرے تھے، آجکل کے مسلمان وہی معنی لیتے ہیں جو میں نے بیان کئے، خدا کی قدرت دیکھو کہ اسی رات کو عین میرے پلنگ کے نیچے طاعون کا چوہا مرا، اور صبح ہی کے میل سے میں ایسا دلی سے بھاگا کہ حیدرآباد آکر دم لیا۔

دوسری دفعہ جو میں ملا تو مولوی صاحب کی صحت جواب دے چکی تھی، چھت پر جو چھوٹا کمرہ تھا۔ اس میں آرہے تھے۔ رعشہ میں اضافہ ہوگیا تھا، آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا تھا۔ پلنگ پر بیٹھے رہا کرتے تھے میں نے کمرے کے دروازہ میں قدم رکھتے ہی بڑی زور سے سلام کیا کہنے لگے "ہیں یہ کون صاحب ہیں" میں نے کہا "میں ہوں" پھر پوچھا، آخر میں کون صاحب ہوئے، نام کیوں نہیں بتاتے" ارے بھئی اب مجھے صاف نہیں دکھائی دیتا ذرا قریب آؤ۔ میں نے کہا، واہ مولوی صاحب واہ" اگر آواز سے نہیں پہچانا تو خوب پہچانا، دور سے پہچانئے تو بات ہے ایک دفعہ ہی ہنس پڑے اور کہنے لگے "اوہو میاں فرحت ہیں"۔ بھلا اور کون یہ بے تکی باتیں کریگا، آؤ بیٹا، اب کے تو کئی برس کے بعد آئے میں پاس گیا گلے لگایا حالات پوچھتے رہے، باتیں کرتے کرتے کہا "ذرا دیکھنا بھئی گھڑی میں کیا بجا ہے" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا کہ ساڑھے نو میں پانچ منٹ ہیں، کہنے لگے اوہو دیر ہوگئی، ذرا میرا جوتا اور جرابیں تو لے آؤ۔ میں نے لاکر جرابیں پہنائیں جوتا سوکھ کر لکڑی ہوگیا تھا، وہ زبردستی پاؤں میں ٹھونسا جوتا پہن کر کھڑے ہو گئے میں نے کھونٹی پر سے اتار کر شیروانی اور ٹوپی دی وہ پہن کر کہنے لگے "چلو بھئی، وقت تنگ ہوگیا ہے" میں نے کہا مولوی صاحب کہاں جانا ہے

کہنے لگے "بیٹا آج ایک مقدمہ کی پیشی ہے۔ وہاں جارہا ہوں" ذرا مجھکو کشمیری دروازے تک تو لے چل" میرا ہاتھ پکڑ کر نیچے اترے باہر دیکھوں تو کوئی سواری نہیں، میں نے کہا مولوی صاحب خدا کے لئے اب اس عمر میں تو اس طرح پیدل نہ پھرا کیجئے، خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے، آخر یہ کس دن کے لئے ہے، روپیہ اسی لئے ہوتا ہے کہ خرچ کیا جائے بال بچوں کی طرف سے بھی بےفکری ہے، پھر کیوں اس بڑھاپے میں آپ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں، ذرا اپنی حالت کو دیکھئے، اور کشمیری دروازے کو دیکھئے یہ دو میل جانا..... اور دو میل آنا آپ کو مضمحل کر دیگا۔ ذرا ٹھہر جائیے، میں گاڑی لے آتا ہوں" بہت بگڑے اور کہنے لگے "تجھ کو میرے معاملے میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے اب چلتا ہے تو چل نہیں تو میں کسی اور کو بلاتا ہوں، ابھی میرے ہاتھ پاؤں نے ایسا جواب نہیں دیا ہے کہ کشمیری دروازے تک نہ جاسکوں میں نے کہا، مولوی صاحب خدا کے لئے اب تو گاڑی رکھ لیجئے، اگر آپ خرچ نہیں اٹھاتے تو میں اٹھاؤں گا" ہنس کر کہنے لگے "کیوں نہ ہو روپیہ اچھلنے لگا ہے، کیا میرے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے کہ گاڑی نہ رکھ سکوں بیٹا بات یہ ہے کہ پہلے تو میں نے اس لئے گاڑی گھوڑا نہیں رکھا کہ سائیسوں سے ڈر لگتا تھا، ایک تو دانہ گھاس چراتے ہیں، دوسرے گھوڑے کی مالش نہیں کرتے، تیسرے گاڑی کا آج یہ توڑا کل وہ توڑا، کون بیٹھے بٹھائے اپنی بھلی چنگی جان کو یہ عذاب لگائے اور دن رات کا فکر مول لے، رفتہ رفتہ پیدل پھرنے کی عادت ہوگئی۔ اب آخری عمر میں گاڑی کی ضرورت ہوئی تو گاڑی رکھتے ہوئے شرم آتی ہے لوگ کیا کہیں گے کہ تمام عمر تو مولوی صاحب جوتیاں چٹخاتے پھرے اب بڑھاپے میں گاڑی پر سوار ہو کر پھرتے ہیں،

نا بھئی نا، اب گاڑی رکھنا وضعداری کے خلاف ہے" میں نے کہا، "تو کمیشن ہی جاری کرا لیا ہوتا"۔ کہنے لگے "وہ بھی میری وضعداری کے خلاف ہے، ہمیشہ کچہری میں

جا کر گواہی دی، اب بڑھاپے میں اس وضعداری کو کیوں چھوڑوں"۔ بہر حال یہی حجت کرتے کچہری پہنچ گئے۔ ڈپٹی صاحب کو اطلاع ہوئی انھوں نے مولوی صاحب کو اپنے کمرے میں بٹھایا اور سب سے پہلے انھیں کا مقدمہ لیکر انکی شہادت قلم بند کی، اور یہ جس طرح گئے تھے اسی طرح ہانپتے کانپتے میرا ہاتھ پکڑ کر گھر آئے۔

حیدر آباد آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ اس چہکتے ہوئے بلبل نے اس گلشن دنیا سے کوچ کیا۔ جب کبھی دلی جاتا ہوں تو مولوی صاحب کے مکان پر ضرور جاتا ہوں، اندر قدم نہیں رکھتا، مگر باہر بڑی دیر تک دیوار سے لگ کر دروازے کو دیکھا کرتا ہوں، اور رہ رہ کر ذوقؔ کا یہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور سارے جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

اللہ بس باقی ہوس

# خوش مذاقی

## Light Humour

ادب اُردو میں جہاں اور بہت سی باتیں ناپید ہیں اس قسم کی ظرافت بھی جسے انگریزی میں (Light Humour) کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ ہم نے "خوش مذاقی" مناسب سمجھا ہے بالکل مفقود ہے "خوش مذاقی کی تعریف بہت مشکل چیز ہے البتہ اسکے مفہوم کو اس طرح سمجھا سکتے ہیں کہ آپ ایک معمولی سا مضمون لکھیں اس سرخی سے "ایک روپیہ کی سرگذشت" اور اس کو اس طرح لکھیں کہ پڑھنے والے یہ بھی مانتے جائیں آپ نے لکھا ہے، اور ہنستے بھی جائیں ہنسی کے یہ معنی نہیں کہ آدمی قہقہہ کا بم ہی اڑائے کھلکھلا کر بندوقوں کی باڑ سی ہی داغ دے، ہنسی ایک ذہنی کیفیت ہے ایک طرح کی بشاشت یا زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہئے ایک نفسی انبساط ہے اگر دل و دماغ پر ایک انبساط کی کیفیت چھا جائے اور کبھی کبھی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل جائے اور ایک آدھ دفعہ قارئین پھول کی طرح ہنس پڑیں تو ایسا مضمون "خوش مذاقی" کا بہترین نمونہ ہوگا "خوش مذاقی" کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رکاکت اور سوقیانہ پن بالکل نہ ہو، اور منطقی پنیترے اور داؤ پیچ ذہن کے لئے پر لطف ورزش بھی ہو جائیں۔ بہر حال اس نوٹ میں "خوش مذاقی" کے زیادہ تجزیہ کی گنجائش نہیں، یہاں ہمیں اپنے معزز قارئین کی خدمت میں اتنا عرض کرنا ہے کہ قارئین کرام کی خاطر اور اردو ادب میں "خوش مذاقی" کی کمی کے مدنظر ہم اس ٹوہ میں تھے کہ کوئی اس قسم کا نفیس اور گدگدانے والا صاحب قلم ہاتھ لگے ہماری نظر ایک صاحب پر پڑتی، لیکن کچھ تو طبعی کاہل وجودی اور بہت کچھ عدیم الفرصتی کی وجہ سے ان کو لکھنے پر آمادہ کرنا جوئے شیر کا لانا تو نہیں ہاں کسی قدر ریاضت مجبوبہ

کے رام کرنے سے کم نہ تھا، انھیں کے قلم کی ستم ظریفی ہے اور انھوں نے اس کو لپند فرمایا کہ "مرزا الم نشرح" کے نام کے پردے میں اپنے آپ کو مخفی رکھیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے قارئین "اس الم نشرح" اخفا کا خیال نہ فرمائیں گے۔ ایسی صورت میں "مرزا الم نشرح"۔ کی لطیف تحریر اور لطیفہ سنج طبیعت ان کو محظوظ کرتی ہے ہماری نظر میں ان کا مضمون "ایک نواب صاحب کی ڈائری کے چند پراگندہ صفحے" جو قارئین کے ملاحظہ میں پیش ہیں اور اسی قبیل کے مضامین جو آئندہ ہدیۂ ناظرین ہوں گے" خوش مذاقی" کی ان خصوصیات سے سجے اور سنورے ہوئے پائے جائیں گے جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے مطالعہ کے بعد ہمیں یقین ہے کہ یہ بات آپ پر خود" الم نشرح ہو جائے گی۔ فقط

محمد عظمت اللہ خاں صاحب

بی۔ اے

# ایک نواب صاحب کی ڈائری کے

## چند پراگندہ صفحے

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ عرصہ سے فکر میں تھا کہ رسالہ نمائش کے لئے کوئی مضمون لکھوں، مگر اسکے لئے فرصت چاہئے۔ مجھے دفتر سے چھٹکارا نہیں چند روز ہوئے پیارے لال پنساری کے ہاں سے گھر میں کچھ سودا آیا تھا۔ میں دفتر سے آکر لیٹا تھا، پڑیوں پر نظر پڑی، اٹھاکر دیکھنے لگا۔ معلوم ہوا کہ کسی کی سوانحعمری کے صفحات ہیں، مضمون دلچسپ اور خط صاف تھا، تمام پڑیاں کھول ڈالیں، دیکھوں تو عجب پرلطف واقعات ہیں۔ اسی وقت پیارے لال کے ہاں پہنچا، وہاں اور بھی چند کاغذات ملے، مگر سب متفرق و پریشان۔

جو کچھ ملا ہے اسکی نقل روانہ کرتا ہوں، میں محنت سے بچا اور آپ کو ایک دلچسپ مضمون مل گیا۔ لیکن افسوس اس کا ہے کہ ڈائری کا مکمل نسخہ نہ ملا اور نہ اب ملنے کی امید ہو سکتی ہے، خیر حاضر میں حجت نہیں۔

والسلام

(مرزا الم نشرح)

# دیباچہ ڈائری

یہ ناچیز خادم ملک وملت نواب اسد یار خاں ناظرین کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ اس کمترین کو کتوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے اور رہنی بھی چاہئے۔ کیونکہ جب باری تعالیٰ نے ان ناپاک ہستیوں کو نجس العین فرمایا ہے تو انسان ضعیف البنیان کی کیا ہستی ہے کہ ان احکام کی خلاف ورزی کرے، اور جب ہمارے ہادی برحق نے کتوں سے کنارہ کرنے کی ہدایت فرمائی ہے تو اب کس کی مجال ہے کہ ان ہدایتوں پر عمل کرنے سے گریز کرے۔

اکثر اصحاب اس ناچیز سے دریافت فرماتے ہیں کہ آخر کتوں سے نفرت کرنے کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب تو پہلے شکسپیر کے اس فقرے سے دیتا ہوں "جذبات انسانی طبیعت کے تابع ہیں، طبیعت اپنے حسب دلخواہ ان جذبات کو نفرت یا رغبت جس طرف چاہے پھیر دیتی ہے" دوسرے میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ میرے خیال ناقص میں کتوں کو ہلاک کرنا کار ثواب ہے۔ ثواب ہی نہیں بلکہ جہاد، اور جہاد بھی کیسا کہ جہاد اکبر، یہ تو سب جانتے ہیں کہ کافر نجس ہیں، نجس العین نہیں اور یہ بھی ثابت ہے کہ کتے نجس العین ہیں، جب نجس کو ہلاک کرنا جہاد ہے تو نجس العین کو مارنا یقیناً جہاد سے بھی کچھ افضل ہے یہی خیالات تھے جس کی وجہ سے میں کتوں کا جانی دشمن ہو گیا جہاں پاتا، مارتا، اور جہاں دیکھتا کم سے کم دو لاتیں تو ضرور رسید کر دیتا البتہ بعض کتے بڑے زبردست اور خوفناک ہوتے ہیں، ایسی صورت میں چونکہ اپنی جان کی حفاظت فرض ہے اس لئے ذرا احتیاط کو کام میں لانا، کبھی کچلہ سے کبھی کسی طرح ان کو ٹھکانے لگاتا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری محنت مشکور ہوئی۔ اور میری اس

سرگرمی کی یہ داد ملی کہ پبلک نے مجھے "غازی" کے بجائے "نواب کتے مارخاں" کا خطاب دیا
(اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیعُ اَجْرَ المُحْسِنِینَ)

جو جو مشکلات اور مقابلے مجھے اس جہاد میں پیش آئے ان کو میں نے اپنی ڈائری سے لے کر ایک جگہ جمع کیا اور اس کا نام "فتوح الکلاب" رکھا ہے

نوشتہ بماند سیہ بر سفید نویسندہ را نیست فردا امید

امید ہے کہ قارئین کرام ان حالات کو پڑھ کر فائدہ اٹھائیں گے اگر میری اس تحریر نے بعض اصحاب کے دل میں کتوں سے نفرت پیدا کر دی، اور وہ میری طرح کتوں کو مارنے میں ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو گئے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی ہے

نصیحت کے سودمند آیدش کہ گفتار سعدی پسند آیدش

والسلام علیٰ من تبع الہدیٰ

(خاکسار نواب کتے مار خاں)

نوٹ:۔ اس کے بعد کے چند صفحات غائب ہیں۔

---

کتا پیٹھ میں مکان ملا۔ سامنے ہی ایک نواب صاحب رہتے تھے۔ ان کا بڑا کارخانہ تھا، میری شوخی قسمت (یا خوش قسمتی سے) ایک بڑا زبردست کتا بھی ان کے ہاں پلا ہوا تھا۔ جب دیکھو دروازے کے باہر بیٹھا ہے، اور ہر آنے جانے والے پر بھونکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مارنا مجھ پر فرض ہو گیا، آمنے سامنے کے مقابلے کی تو ہمت نہ پڑی، ہاں یہ ترکیب اختیار کی کہ جب ادھر سے گذرتا کوئی نہ کوئی چیز اس کے کھانے کو ڈال دیتا اس کو بھی کھانے کا چسکا پڑ گیا اور چند دنوں میں مجھ سے کسی قدر مانوس ہو گیا، آخر ایک دن دہی میں کچلا دے کر اس کو جہنم واصل کر دیا۔

نواب صاحب کو خبر ہوئی وہ میرے خطاب اور حالات سے واقف تھے۔ مگر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے میرا کچھ بگاڑ نہ سکتے تھے۔ اس لئے خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گئے چلو گئی گذری بات ہوئی۔

ایک روز میں باہر گیا ہوا تھا۔ کوئی دس گیارہ بجے جو واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے دروازے کے سامنے کتوں کا جمگھٹا ہے اور میونسپلٹی کا چپراسی ایک ٹوکری بغل میں مارے کتوں کو گوشت پھینک رہا ہے۔ مجھے بہت برا معلوم ہوا۔ بچتا بچاتا چپراسی کے پاس تک پہنچا اور کہا "بد معاش یہ تو نے کیا گڑ بڑ مچائی ہے، کیا اپنے باوا کی فاتحہ کا کھانا تقسیم کرنے کو میرا ہی دروازہ ملا۔ اب یہاں سے جاتا ہے یا نہیں یا پھر اور طرح خبر لوں" چپراسی ناک بھوں چڑھا کر بولا "اجی جاؤ جی جاؤ" ہم سرکاری حکم کی تعمیل کر رہے ہیں، حکم ہوا ہے کہ روز دس سیر گوشت اس جگہ کتوں کو ڈالا جائے" سرکاری سڑک ہے ایسا ہی برا معلوم ہوتا ہے۔ تو جا کر ہمارے نام کی نالش کر دو" گوشت کی بو پا کر ادھر ادھر سے کتے ٹوٹ پڑے اور تھوڑی دیر میں ہزاروں کا مجمع ہو گیا۔ راستہ بند گھر میں جاؤں۔ تو کس طرح جاؤں اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ ایسی بڑی فوج کو چیر پھاڑ کر گذر جاؤں آخر سوچتے سوچتے یہ سوجھی کہ اس بارے میں کسی وکیل سے مشورہ کرنا چاہئے، ان دنوں لالہ شیو سیوان لل کی وکالت زوروں پر تھی۔ سیدھا ان کے پاس پہنچا تمام واقعہ بیان کیا اور کہا کہ نواب بخول خاں پر میری جانب سے استغاثہ دائر کیجئے انھوں نے کہا کہ اس کا کیا ثبوت ہے۔ کہ یہ کارروائی نواب صاحب.... ہی نے کی ہے، میں نے کہا ہو نہ ہو یہ انہی کی کارستانی ہے وہ میونسپل کمیٹی کے ممبر ہیں انھوں ہی نے اس نامعقول چپراسی کو اس لنگر کی تقسیم پر مقرر کیا ہے"۔ وکیل صاحب نے کہا کہ قیاسات پر کسی کو ملزم نہیں بنایا جا سکتا" میں نے کہا" تو میونسپل کمیٹی کو ملزم بنا دیجئے"، انھوں نے اس سے بھی انکار کیا، تو میں نے جل کر کہا تو اچھا کتوں ہی کو ملزمین بنا لیجئے"۔

وکیل صاحب... معاف فرمایئے میں کتوں کو ملزمین بنا کر اپنی وقعت کھونا نہیں چاہتا میں.... معلوم ہوتا ہے کہ کتوں میں آپ کی بڑی قدر و منزلت ہے، اور ان میں اپنی وقعت کم ہونے سے آپ گھبراتے ہیں، یا شاید پہلے جنم میں آپ کتے تھے کہ اپنے سابقہ رشتہ داروں اور دوستوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتے وکیل صاحب نے بہت نیلے پیلے ہوکر میری طرف دیکھا مگر سمجھ گئے کہ ہاتھ پاؤں سے مجھ پر ور آنا مشکل ہے، اس لئے کہنے لگے" جناب میں نے عدم تعاون کے اصول پر کار بند ہو کر وکالت ترک کر دی ہے، آپ کسی دوسرے وکیل کی تلاش کیجئے۔"

یہاں سے کورا جواب مل گیا تو میں نے دل میں کہا کہ چلو خود ہی قانون دیکھ ڈالو نہیں وکیل صاحب میں کیا سرخاب کا پر ہے کہ یہی قانون سمجھتے ہیں دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ راستہ میں آتے آتے تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری خرید لیا۔ گھر پہنچ کر تمام رات میں ان دونوں کتابوں کو دیکھ ڈالا، معاملہ کوئی پیچیدہ نہ تھا، قانون صاف تھا، کتوں کے افعال سے جرم مزاحمت بیجا پورا ابنتا تھا۔ چنانچہ دفعہ (۳۳۹) تعزیرات ہند کے تحت استغاثہ مرتب کیا۔ ترتیب استغاثہ کے وقت یہ دقت پیش آئی کہ آخر ملزمین کن کو بنایا جائے۔ قانون پر غور کرنے کے بعد میں نے استغاثہ کا عنوان اس طرح قائم کیا،

نواب اسد یار خاں المخاطب بہ کتے مار خاں بہادر... مستغیث

بنام

جمیع سگاں خورد و کلاں بازاری (فاتر العقل) بولایت میونسپل کمیٹی..... ملزمان

علت

مزاحمت بیجا زیر دفعہ (۳۳۹) تعزیرات ہند

استغاثہ میں تمام واقعات مذکورہ بالا کی صراحت کر کے استدعا کی گئی تھی کہ چونکہ فاتر العقل ہونے کی وجہ سے کتے مستثنیات عامہ کی دفعہ ۸۴ میں داخل ہو جاتے ہیں

اس لئے بعد تحقیقات میونسپل کمیٹی کو سزائے قانونی صادر فرمائی جائے۔

استغاثہ مرتب کرکے دوسرے دن ڈپٹی کلب علی خاں صاحب مجسٹریٹ ضلع کے اجلاس پر داخل کر دیا میرے حلفی بیان کے بعد عدالت سے میونسپل کمیٹی کے نام سمن جاری ہوئے اور تاریخ پیشی پر مقدمہ ہوا، میونسپل کمیٹی کی جانب سے مسٹر کولی بیرسٹرایٹ لا کونسل تھے۔ اپنی طرف سے میں نے خود پیروی کی،

سب سے پہلے کونسل ملزمین نے یہ بحث چھیڑی کہ میونسپل کمیٹی کتوں کی ذمہ دار نہیں ہوسکتی، دوسرے یہ کہ کتوں کے فاترالعقل ہونے کی کوئی شہادت یا ثبوت نہیں ہے مجسٹریٹ صاحب نے میری طرف دیکھا میں ان مباحث کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا میں نے بحث کی کہ میرے فاضل دوست نے اپنی بحث کی ابتدا ہی غلط کی ہے کہ پہلے ولایت کا مسئلہ چھیڑا ہے اور بعد میں کتوں کے فاترالعقل ہونے کا ثبوت طلب کیا ہے چاہئے یہ تھا کہ پہلے کتوں کے فاترالعقل ہونے پر بحث کی جاتی اگر وہ فاترالعقل قرار پاتے تو اس صورت میں ولایت سے بحث کی جاتی،

بہرحال پہلے میں اپنے فاضل دوست سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کتوں کے فاترالعقل تسلیم کرنے میں کیوں تامل ہے۔

مسٹر کولی۔ میں بغیر ثبوت کے کسی چیز کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

ڈپٹی صاحب۔ میرے خیال میں بعض کتے اپنے مالکوں سے زیادہ ہوشیار اور سمجھ دار ہوتے ہیں،

مسٹر کولی۔ جناب والا صحیح ارشاد فرماتے ہیں، خود میرا کتا تو بس ایسا ہی ہے۔

میں۔ ممکن ہے کہ مسٹر کولی کا کتا خود ان سے زیادہ ہوشیار اور سمجھدار ہو۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ کتے فاترالعقل نہیں ہوتے بلکہ اگر منطقی نتیجہ نکل سکتا ہے تو یہ نکل سکتا ہے کہ مسٹر کولی کتوں سے بھی زیادہ فاترالعقل ہیں،

مسٹر کولی۔ جناب والا میں ان الفاظ کی برداشت نہیں کر سکتا۔

میں۔ حضور اس مسئلہ کا صغریٰ اور کبریٰ خود مسٹر کولی نے قائم کیا ہے، میں نے تو صرف اس کی بنا پر نتیجہ کا اظہار کیا ہے، مجھے کیا معلوم تھا کہ مسٹر کولی کتوں سے زیادہ بیوقوف ہیں، انھوں نے خود اپنی عقل کا معیار ظاہر کیا۔ تعجب ہے کہ اسی کے دہرانے کو یہ اپنی توہین خیال فرماتے ہیں،

ڈپٹی صاحب۔ اچھا اب آپ اپنی بحث کی طرف رجوع کیجئے۔

میں۔ جناب والا کسی کے عاقل یا فاترالعقل ہونے کا اندازہ اس کے افعال سے لگایا جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ کتے بازاروں میں کھڑے ہڈیاں چباتے ہیں اور ان کو اپنے اس فعل پر شرم تک نہیں آتی تو ان کے فاترالعقل کہنے میں کون امر مانع ہو سکتا ہے کیونکہ خود ان کے افعال انکے فاترالعقل ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

مسٹر کولی۔ میرے خیال میں ان کا اس طرح ہڈیاں چبانا ان کے فاترالعقل ہونے کا ثبوت قطعی نہیں ہے۔

میں۔ اگر میرے فاضل دوست سڑک پر کھڑے ہو کر ہڈیاں چبانے لگیں اور کوئی انکو فاترالعقل نہ کہے تو میں کتوں کو بھی فاترالعقل کے زمرہ سے نکال دینے پر بالکل تیار ہوں۔

مسٹر کولی۔ میں معزز عدالت کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ مستغیث نے جو الفاظ میری نسبت استعمال کئے ہیں وہ میری توہین کی حد تک پہنچتے ہیں۔

میں۔ جناب والا میرے فاضل دوست نے ثبوت طلب کیا۔ میں نے منطق سے اسکا

---

نوٹ:۔ یہ کچھ عجیب اتفاق ہے کہ ہمارے نوابصاحب کو مکان ملا تو کتا بیٹھ ہیں، مد مقابل ملے تو بخول خاں، بیرسٹر ملے تو مسٹر کولی، ڈپٹی صاحب ملے تو کلب علیخاں، وکیل صاحب ملے تو شیو سیوان لال غرض کتوں کے تلازمہ سے کہیں نجات نہیں ملی واقعی ع۔ اتفاقات ہیں زمانے کے ؛

جواب دیا۔ اگر یہ میرے اعتراض کا عملی ثبوت دینے پر تیار نہیں ہیں یہ کتوں کو فاترالعقل تسلیم کر لیں، چلو چھٹی ہوئی نہ مجھ کو حجت نہ ان کو شکایت۔

ڈپٹی صاحب۔ بہتر ہوگا کہ اگر آپ اس قسم کی تمثیلات سے پرہیز کریں،

میں۔ جناب والا قانون ہمیشہ تمثیلات سے اچھی طرح سمجھا جاتا ہے۔ اگر تمثیلات سے جناب کو ایسی ہی نفرت ہے تو مناسب ہوگا کہ قانون سے اس کو خارج کر دینے کی تحریک فرمادی جائے

ڈپٹی صاحب۔ آپ خیال رکھیں کہ یہ گفتگو آپ کہاں کر رہے ہیں ممکن ہے کہ آپ کے الفاظ کی بنا پر تحقیر عدالت کا مقدمہ آپ پر قائم ہو جائے۔

میں۔ حضور والا کی تقریر سے خود میری حجت کی تائید ہوتی ہے۔ عدالت کوئی عاقل شے نہیں ہے، جس کی تحقیر ہو سکے۔ اگر خدانخواستہ تحقیر ہو گی تو جناب والا کی۔ اور اگر مقدمہ قائم ہوگا تو اس عنوان سے قائم ہو سکے گا:۔

"عدالت (فاترالعقل) بولایت صاحب مجسٹریٹ بہادر مستغیث"۔

ڈپٹی صاحب۔ آپ اپنی بحث میں احتیاط کیجئے اور آگے چلئے۔

میں۔ دوسری بحث فریق مخالف کی جانب سے یہ کی جاتی ہے کہ میونسپل کمیٹی کتوں کی ولیہ نہیں ہے اس کا جواب میں میونسپل کمیٹی کے ضابطہ سے دینا چاہتا ہوں میرے فاضل دوست اس امر کو تسلیم کریں گے کہ تمام رعایا کے مکانات سے میونسپل کمیٹی ٹیکس وصول کرتی ہے۔ لیکن جو جائداد خود میونسپل کمیٹی کی ہے، اس پر ہوس ٹیکس نہیں لیا جاتا اصول یہ ہوا کہ میونسپل کمیٹی کی جو چیز ہے وہ ٹیکس سے مستثنیٰ ہے اب اس کا عکس ملاحظہ کیجئے رعایا کے کتوں پر میونسپل کمیٹی ٹیکس لیتی ہے، لیکن بازاری کتوں پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ جنگلی کتے میونسپل کمیٹی کی ملک ہیں اور چونکہ (جیسا کہ میں اوپر ظاہر کر آیا ہوں) یہ کتے فاترالعقل ہیں اس لئے ان کا مالک و قابض یعنی میونسپل کمیٹی ان کی

دلیہ جائز ہے۔

مسٹر کولی۔ میں معزز عدالت سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے دوست کے ان فقروں سے میرے موکلین کی توہین ہے۔

میں۔ میں اپنے فاضل دوست سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے موکل کتے ہیں یا میونسپل کمیٹی؟ اس صراحت کی مجھے اس لئے ضرورت ہوئی ہے کہ مستغیث کی نگاہ میں بحیثیت ملزمین اس مقدمہ میں کتوں اور میونسپل کمیٹی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

مسٹر کولی۔ میں معزز عدالت کو پھر توجہ دلاتا ہوں کہ یہ دوسرے پہلو سے میرے موکلین پر حملہ کیا جارہا ہے،

میں۔ میرے فاضل دوست نے میرے سوال کا جواب عنایت نہیں فرمایا۔

مسٹر کولی۔ میں میونسپل کمیٹی کی طرف سے پیروی کررہا ہوں،

میں۔ جب مسٹر کولی کتوں کی طرف سے کونسل نہیں ہیں۔ اور یہ میونسپل کمیٹی کو کتوں کی دلیہ بھی تسلیم نہیں کرتے تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ کون سے قاعدہ کی رو سے کتوں کی طرف سے بحث کررہے ہیں ان کو چاہئے تھا کہ اپنے موکل کا نام زمرہ ملزمین سے خارج کرانے کی کوشش کرتے، میں جانتا اور بقیہ ملزمین، ہم خود آپس میں بھگت لیتے۔ بحالت موجودہ میونسپل کمیٹی نے جو ایک بیرسٹر مقرر کرکے رعایا کا روپیہ برباد کیا ہے اسکے متعلق میں عدالت سے نہایت ادب کے ساتھ درخواست کرونگا کہ مجھے رعایا کی جانب سے میونسپل کمیٹی پر خیانت مجرمانہ زیر دفعہ (۴۰۹) تعزیرات ہند مقدمہ دائر کرنے کی اجازت دی جائے۔

ڈپٹی صاحب۔ آپ صرف اپنے مقدمہ سے سروکار رکھئے۔

مسٹر کولی۔ میں مستغیث کے ان مباحث قانونی کا کوئی جواب دیکر عدالت کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ معزز عدالت خود انکی وقعت پر غور کرکے فیصلہ صادر فرماسکتی ہے

مجھے صرف ایک قانونی بحث اور کرنی رہ گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ تعزیرات ہند میں صرف افعال اشخاص سے بحث کی گئی ہے، جانوروں کے افعال اس میں داخل نہیں ہو سکتے اگر تسلیم کر لوں کہ چند کتے مستغیث کے دروازہ کے سامنے جمع ہوئے اور بالفرض محال انکے سدراہ بھی ہوئے تو انکے افعال انکو مزاحمت بیجا کے جرم کے تحت میں نہیں لا سکتے،

میں۔ میں اپنے فاضل دوست کی اس بحث کی قدر کرتا ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تعزیرات ہند کو نہایت سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ میں ان سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ، کیا میونسپل کمیٹی قانوناً شخص کی تعریف میں داخل ہو سکتی ہے۔

مسٹر کولی۔ ہو سکتی ہے،

میں۔ یہ کیونکر؟

مسٹر کولی۔ کیونکہ چند میونسپل کمشنروں کے مجموعہ کا نام میونسپل کمیٹی ہے اس وجہ سے لفظ (شخص) کا اطلاق قانوناً اس پر ہو سکتا ہے،

میں۔ میرے فاضل دوست نے خود اپنے اس جواب سے اپنے اعتراض کو رفع کر دیا جب چند جانداروں کے مجموعہ پر لفظ (شخص) کا اطلاق ہو سکتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کتوں کا مجموعہ لفظ (شخص) کے تحت میں کیوں نہ آئے اور جب کتوں کا مجموعہ لفظ (شخص) سے قانوناً تعبیر کیا جا سکتا ہے، تو جو افعال اس کتوں کے مجموعہ سے سرزد ہوئے ہیں ان سے تعزیرات ہند کے جرائم کے متعلق ہو جائیں گے۔

مسٹر کولی۔ میں اس بحث کے سمجھنے سے قاصر ہوں،

میں۔ مجھے آپ کے دماغ سے یہی امید تھی، کیا اچھا ہوتا اگر آپ اپنے کتے کو بھی ساتھ لے آتے شاید دونوں مل کر اس بحث کو سمجھ لیتے۔

ڈپٹی صاحب۔ اچھا آگے چلئے۔

میں۔ اب رہی یہ بحث کہ کتوں کا سدراہ ہونا مزاحمت بیجا ہو سکتا ہے۔ یا نہیں

تو میں اسکے متعلق نہایت زور سے کہونگا کہ ہو سکتا ہے، اور ضرور ہو سکتا ہے میں اپنی اس بحث کو ایک تمثیل سے بہت اچھی طرح ذہن نشین کرا سکتا ہوں، فرض کیجئے ہمارے بیرسٹر صاحب اپنے مکان میں داخل ہونا چاہتے ہیں، اور ہمارے ڈپٹی صاحب انکے سدراہ ہوتے ہیں، اور اس کشمکش میں ہمارے فاضل دوست کے دو چار ٹھوکریں بھی پڑ جاتی ہیں، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا مزاحمت بیجا کا جرم مکمل ہو گیا؟

مسٹر کولی۔ جرم ضرور ہوا مگر جن الفاظ میں وہ بیان کیا گیا ہے، وہ عدالت کی توجہ کا محتاج ہے،

میں۔ اب بیرسٹر صاحب کے دروازہ پر ڈپٹی صاحب کو کتا سمجھ لیجئے اگر یہ اس کشمکش میں ہمارے فاضل دوست پر بھونکیں اور کاٹ بھی کھائیں، تو کیا جرم مزاحمت بیجا مکمل نہیں ہوا؟۔

مسٹر کولی۔ مفروضات کو قانون میں دخل نہیں ہے۔

میں۔ یہ قانونی مفروضات ہیں، میں اوپر ثابت کر آیا ہوں کہ کتے لفظ (شخص) کی تعریف میں قانوناً آسکتے ہیں، اور آپ یہ تسلیم کریں گے کہ ڈپٹی صاحب بھی قانوناً (شخص) ہیں۔ اس لئے اپنی بحث میں اگر میں نے یہ فرض کر لیا کہ ڈپٹی صاحب کتے ہیں تو کیا ظلم کیا، بہر حال جب ڈپٹی صاحب کا سدراہ ہونا جو مسٹر کولی سے کم تعلیمیافتہ ہیں۔ مزاحمت بیجا ہے تو کتوں کا سدراہ ہونا بدرجہ اولیٰ مزاحمت بیجا ہے کیونکہ ہمارے فاضل دوست تسلیم کرتے ہیں کہ بعض کتے ان سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں۔

اس سے آگے کے صفحات غائب ہیں،

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

خدا خدا کر کے مکان ملا، مکان گو چھوٹا تھا۔ لیکن میری ضرورت کو کافی تھا۔ گھر میں تھا کون (میں میری بلیاں)، اور ایک گھوسٹ ماما، دیوار بیچ مولوی قطمیر صاحب کا مکان تھا

بیچارے بڑے بھلے آدمی معلوم ہوتے تھے، مجھ سے آکر ملے حالات دریافت کئے باتوں باتوں میں کتا پلٹھہ کے مکان چھوڑنے کا بھی ذکر چھیڑ دیا، میں نے تمام واقعات بیان کئے کہنے لگے بھئی معاف کرنا، میرے ہاں بھی ایک کتا پلا ہوا ہے۔ مگر بہت غریب ہے اور میں کوشش کروں گا کہ وہ آپ کو آکر تکلیف نہ دے کتے کا ذکر سنتے ہی جو وقعت مولوی صاحب کی میرے دل میں قائم ہوئی تھی۔ وہ ایک قلم جاتی رہی اس کے بعد میں نے ان سے کچھ اکھڑی اکھڑی باتیں کیں اور وہ کسی قدر کشیدہ خاطر ہوکر میرے پاس سے اٹھ گئے چار روز تک کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، پانچویں روز میں صحن میں بیٹھا تھا۔ کہ ایک نہایت بدصورت کالا کتا بنجانہ کی موری سے نکل کر بہت اطمینان سے اندر آیا اور اس طرح ٹہلنے لگا گویا اس کے باوا کا مکان ہے، میں نے بہت دھت دھت کی اس نے یہ بھی نہ جانا کہ کون کتا بھونک رہا ہے میں نے فہیمن کو پکارا، وہ باورچیخانہ سے لکڑی لے کر دوڑی جب کہیں جاکر یہ بلا دفعہ ہوئی۔ اب مشکل یہ آپڑی کہ بنجانہ کے برابر والی دیوار مولوی قطمیر صاحب کی تھی اور موری بھی انھیں کی تھی موری بند کس طرح کرتا۔ آخر سوچتے سوچتے ایک ترکیب سوجھی، کوئی دو من کا پتھر لے کر عین موری کے اوپر منڈیر کے بالکل کنارے پر رکھا۔ پتھر میں رسی باندھی اور موری کے سامنے بیچوں بیچ ایک لمبی سی کیل گاڑ کر اور رسی کو تان کر اس کا دوسرا سرا کیل میں باندھ دیا، اور دل میں کہا، لو بیٹا اب تو تم آنا کھوپڑی چور مچور نہ ہو جائے تو میرا نام نواب کتے مار خاں نہیں وہ دن تو خیر سے گذر گیا۔ دوسرے دن صبح ہی کو مولوی صاحب کے کتے نے میرے مکان میں سرگشت کا ارادہ کیا۔ میں صحن میں بیٹھا ان کی کارگذاری دیکھ رہا تھا انھوں نے نہایت اطمینان سے موری میں سر ڈالا سر رسی سے ٹکرایا ادھر انھوں نے زور کیا ادھر پتھر آہستہ آہستہ منڈیر سے کھسکنا شروع ہوا ادھر یہ موری سے باہر نکلے ادھر پتھر اوپر سے آیا قیں کر کے وہیں ٹھنڈے ہوگئے مولوی صاحب کی بیوی نے جو آواز سنی تو غل مچایا

"ہائے ہائے مولوی صاحب اس حرام زادے نواب نے میرے کتے کو مار ڈالا، خدا اسکو غارت کرے" ایک لمحہ نہ گذرا تھا کہ مولوی صاحب میرے مکان میں آئے اور بغیر سلام علیک کئے موری کے پاس پہنچے کتے کو پتھر کے نیچے سے نکالا اور اسی طرح چپ چاپ واپس چلے گئے، مجھے خیال تھا کہ کچھ کلچپ ہو جائے گی، لیکن انکے اس تحمل پر مجھے تعجب ہوا اور میں نے دل میں کہا کہ چلو مفت میں ایک کتا تو کم ہوا۔ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

مجھ کو اگر معلوم ہو جاتا کہ مولوی صاحب کا سکون طوفان کی آمد کا پیش خیمہ ہے تو میں پہلے ہی سے گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ اس کے بعد بی فہیمن کا مولوی صاحب کے ہاں آنا جانا بڑھا۔ جب دیکھو باورچی خانہ خالی پڑا ہے۔ میں نے کہا بی فہیمن اس طرح راہ و رسم بڑھانا اچھا نہیں تمھیں میرے پاس رہنا ہے تو سیدھی طرح رہو، ورنہ خدا حافظ تمھیں نوکری کی کمی نہیں اور مجھے نوکروں کا توڑا نہیں"۔ بی فہیمن نے کہا میاں میں آپ کا کام کاج کر کے دو گھڑی رحمت کی ماں کے پاس جا بیٹھتی ہوں اگر آپ کو یہ ناگوار ہے تو آج سے نہ جایا کروں گی۔"

..... یہ سنکر میں چپ ہو رہا۔

دوسرے دن شام کو بی فہیمن ہانپتی کانپتی میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں "میاں مجھے بخار چڑھ رہا ہے آپ اجازت دیں تو گھر ہو آؤں۔ کھانا پکا دیا ہے آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ اگر آپ کھانا کھا کر سامان باورچیخانہ میں رکھدیں تو انشاء اللہ میں کل صبح آکر دیکھ لوں گی۔"

میں نے کہا:"اس میں کیا ہرج ہے جاؤ گھر ہو آؤ۔ مگر کل ضرور آجانا، ورنہ مجھے تکلیف ہوگی" وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی، اور میں نے باہر کے دروازہ کی کنڈی لگائی، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کمبخت بھی مولوی صاحب سے مل گئی تھی، بخار کا صرف

بہانہ تھا۔ مجھے صرف تنہا مکان میں چھوڑ جانا مقصود تھا،

خیر تھوڑی دیر بعد میں نے اٹھ کر وضو کیا عشاء کی نماز پڑھی، گرمیوں کا موسم تھا۔ باہر سیتل پاٹی ڈالی۔ باورچیخانہ میں سے کھانا نکال کر لایا۔ منھ میں نوالہ رکھنا ہی چاہتا تھا کہ بیچانہ کی موری کی طرف سے قیاؤں کی آواز آئی اور ساتھ ہی ایک کالا جگادری کتا صحن میں نازل ہوا۔ میں نے ہش ہش کی، مارنے کو لکڑی اٹھائی وہ موری کی طرف بھاگا لیکن موری تک نہ پہنچا تھا کہ ایک دوسرا کتا اسی راستہ سے اندر داخل ہوا اسکے بعد تو کتوں کی قطار لگ گئی، ایک دو تین چار، دس بارہ، بیس پچیس خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کم از کم تیس پنتیس کتے اندر گھس آئے، تمام صحن بھر گیا، ایک کو ماروں دو کو ماروں آخر کن کن کو ماروں۔ کتوں نے بھی دیکھا کہ ہماری تعداد زیادہ ہے اور یہ شخص کچھ سہما ہوا سا ہے، اور بھی شیر ہو گئے، پہلے مجھ پر غرّائے، ادھر کھانے کی بو ناک میں گئی، ایک دم دسترخوان پر ہلہ بول دیا ان کی یورش سے میں پریشان ہو کر بھاگا۔ کتے سمجھے گھر میں یہی ایک غیر جنس ہے مجھ پر پل پڑے مجھ کو اس وقت اور کچھ سدھ نہ رہا سامنے پنکھا لٹکا ہوا تھا۔ جست کر کے اوپر چڑھ گیا۔ ایک کتے نے چڑھتے چڑھتے پاؤں پر منھ بھی مارا۔ مگر میں جوں توں کسی نہ کسی طرح پنکھے پر جا ہی بیٹھا، اب کیا تھا حرامزادوں کو خوان یغما مل گیا، نہایت فراغت سے دسترخوان صاف کر دیا۔ اور ہم خون کے گھونٹ پیتے پنکھے پر بیٹھے رہے، کھانے اور لڑنے سے فراغت پا کر بدمعاشوں نے مکان کے کونے کونے پر قبضہ کر لیا۔ کوئی کہیں جا بیٹھا۔ کوئی کہیں، دو زبردست کالے کتے عین میرے پنکھے کے نیچے بآرام تمام آ کر قالین پر دراز ہو گئے،

جب ذرا امن ہوا تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ اس واردات کی بنا پر ان کتوں اور مولوی قطمیر صاحب پر کیا جرائم عائد ہو سکتے ہیں، تعزیرات ہند پاس نہ تھی لیکن اسکی دفعات دھیان میں نہیں۔ آخر رائے یہ قرار پائی کہ نقب زنی بلوہ اور ڈاکہ کے

جرائم کتوں پر اور ان جرائم کی اعانت کا الزام مولوی صاحب پر قائم کیا جا سکتا ہے، وہیں بیٹھے بیٹھے استغاثہ کا مضمون بھی دل میں سوچ لیا۔ غرض اسی فکر میں رات کے کوئی بارہ بج گئے۔ نیند کا غلبہ ہوا آنکھیں بند ہونے لگیں اور آخر کار آنکھ لگ گئی، کیا دیکھتا ہوں کہ بلوہ نقب زنی اور ڈاکہ کا مقدمہ ڈپٹی صاحب کے اجلاس پر پیش ہوا کتوں کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی اور مولوی صاحب پر اعانت کا جرم ثابت قرار پاکر ۱۰ سال کی قید با مشقت اور دس ہزار روپیہ جرمانہ اور عدم ادائے جرمانہ کی صورت میں مزید تین سال قید با مشقت کی سزا سنادی گئی اور یہ بھی حکم دیا گیا کہ جو جرمانہ وصول ہو اس میں سے حسب دفعہ ۵۴۵ ضابطہ فوجداری نو ہزار روپیہ مستغیث کو دیا جائے یہ سزا مرافعہ میں بحال رہی اور مجھ کو جرمانہ وصول شدہ میں سے نو ہزار روپیہ نقد حسب ضابطہ وصول ہو گئے۔ اب کیا تھا، یار دوستوں نے مبارکباد کی بوچھاڑ کر دی اور تقاضا شروع کیا کہ اس خوشی میں جلسہ کیا جائے، خاص باغ میں جلسہ مقرر ہوا۔ ارباب نشاط بلائے گئے، ساون کا مہینہ ہے۔ امرائی میں جھولا پڑا ہے یہ خاکسار جھولے میں بیٹھا ہے ننھی جان اور بی حفیظن کھڑی جھولا جھلا رہی ہیں؟ ملار گائے جا رہی ہیں، کہ ایک دفعہ ہی جھولے کی رسی ٹوٹی اور میں دھم سے نیچے آ رہا اور گرنے کے ساتھ ہی دو کتوں نے چیخ ماری آنکھ کھل گئی دیکھتا ہوں تو پنکھے کے نیچے پڑا ہوں، معلوم ہوتا ہے کہ پنکھے سے جو گرا تو سیدھا کتوں کے اوپر، انکو اس بلائے ناگہانی کے نازل ہونے کا کیا خیال تھا۔ ہڈیاں پسلیاں چورا ہو گئیں۔ لنگڑاتے اور چیختے ہوئے بھاگے، دوسرے کتے بھی گھبرا گئے۔ ان دونوں زخمیوں نے پہلے دروازہ کا رخ کیا اس کو بند پایا تو سیدھے پنجانہ کی موری کی طرف اور زور کر کے پار ہو گئے۔ جانوروں میں بھیڑیا چال تو ہوتی ہی ہے سب کے سب یکے بعد دیگرے موری سے نکل کر مولوی صاحب کے گھر میں داخل ہو گئے جب یہ آفت دفع ہوئی تو میں اٹھا کولہے میں بہت چوٹ آئی تھی مشکل سے کھسکتا کھسکتا دروازے

کے پاس آیا کنڈی کھولی باہر نکلا اور تمام رات سڑک پر بیٹھ کر گذار دی صبح بی فہیمن سسرخرد چونڈا آئیں۔ میں نے ان کو بہت برا بھلا کہا، اور حساب کر دیا۔ کیونکہ مثل مشہور ہے دشمن کا دوست اپنا دشمن۔ آج میرے ساتھ یہ سلوک کیا کل خدا جانے کیا گل کھلا دیں۔ نو بجے گھر میں آیا کپڑے بدلے بستہ بغل میں مار ہوٹل گیا وہاں کھانا کھایا پھر تعزیرات کی دفعات کو دیکھا، کوتوالی میں رپورٹ کی۔ لیکن انھوں نے مقدمہ کا چالان کرنے سے انکار کیا، اس لئے خود استغاثہ لکھا۔ اور دس بجے عدالت ضلع میں جا کر داخل کر دیا تیس نفر کتوں اور مولوی قطمیر صاحب کو ملزمین بنایا استغاثہ میں نقب زنی بوقت شب حسب دفعہ ۴۵۳ ڈاکہ زیر دفعہ ۳۹۵ اور سلاخ مہلک کے ساتھ بلوہ زیر دفعہ ۱۴۸ تعزیرات ہند کے جرائم قائم کئے کچھ دے دلا کر اسی روز سمن جاری کرا دئے سر رشتہ میں یہ اعتراض ہوا کہ کتوں پر سمن کی تعمیل کیونکر کی جائے انکو فاتر العقل تو کہا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ میونسپل کمیٹی والے مقدمہ میں عدالت نے قرار دیا تھا کہ کتے فاتر العقل نہیں ہیں اس لئے بالآخر بہت کچھ حجت کے بعد یہ طے پایا کہ کتوں کو بالغ اور زیر پرورش مولوی قطمیر صاحب قرار دیکر مولوی صاحب پر جملہ سمنوں کی تعمیل کرادی جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا، گو اس قانونی مسئلہ کے سلجھانے میں میرے کئی روپیہ صرف ہوئے لیکن مجھے اسکی پروا نہ تھی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ آخر مولوی صاحب کے جرمانے میں سے مجھے نو ہزار روپیہ ضرور ملیں گے۔

مولوی صاحب کو یقین نہ تھا کہ معاملہ عدالت تک پہونچے گا اس لئے سمن پہنچنے کے بعد بہت گھبرائے اور مجھ سے آکر معذرت کرنے لگے کہ میرا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں ہے، ساری کارستانی میرے چھوکرے کی ہے، میں نے کہا کہ مولوی صاحب میں شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ کی وجہ سے مجھے ایک اور ملزم کا نام معلوم ہو گیا، کل اس کو بھی زمرۂ ملزمین میں شریک کئے دیتا ہوں، اب رہا معاملہ کا تصفیہ تو وہ یوں ہو سکتا ہے کہ آپ محلہ کے تمام کتوں کو مار ڈالیں، اور چونکہ عدالت سے آپ کے حق میں چھ سال کی

قید اور دس ہزار روپے جرمانہ کی سزا صادر ہونے والی ہے، اس لئے میں اتنا کر سکتا ہوں کہ اگر آپ نو ہزار روپے بطور ہرجانہ ادا کریں تو میں مقدمہ سے دستبرداری کرلوں گا۔ اگر آپ اس پر راضی نہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کی کوئی قوت آپ کو جیلخانہ جانے سے نہیں روک سکتی۔

میری یہ قانونی بحث سن کر مولوی صاحب حیران ہو گئے بہت جز بز ہوئے منھ ہی منھ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے، میں نے کہا۔ مولوی صاحب سنبھل کے بات کیجئے گا۔ آپ کا یہ بڑبڑانا آپ کو ایک اور جرم کا مرتکب کئے دیتا ہے آئندہ آپ کے ہونٹ تو ابھی جا کر استغاثہ میں ازالہ حیثیت عرفی کی دفعہ ۵۰۰ تعزیرات اور بڑھاتا ہوں اس تقریر سے مولوی صاحب کے رہے سہے حواس گم ہو گئے اور وہ دروازے سے نکل نوک دم بھاگے۔

مجھے توقع تھی کہ شاید مولوی صاحب پھر مصالحت کا دروازہ کھٹکھٹائیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی وکیل کے پھندے میں جا پھنسے اور آپ ان لوگوں کے اصول سے واقف ہیں کہ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں ان کو حلوے مانڈے سے کام،

بہر حال تاریخ پیشی آگئی اور میں کتابوں کا پشتارہ بغل میں مارڈپٹی صاحب کے اجلاس پر پہونچ گیا، پہلی پیشی میرے ہی مقدمہ کی تھی، اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ تیس ۳۰ چالیس کتے ایک رسی میں بندھے کھڑے ہیں، رسی کا سرا مولوی قطمیر صاحب کے ہاتھ میں ہے، اور مولوی صاحب مسٹر کوڈلی بیرسٹر ایٹ لا سے کھڑے باتیں کر رہے ہیں، ڈپٹی صاحب اسوقت تک اجلاس پر تشریف نہیں لائے تھے، میں نے کوڈلی صاحب سے کہا، کیا آپ ان تمام ملزمین کے وکیل ہیں؟" انھوں نے کہا" "ہاں" میں نے کہا "کیا مناسب نہ ہوگا کہ ان ناپاک مسیتیوں کو عدالت کے کمرے سے خارج کر دیا جائے" انھوں نے کہا "نہیں ملزمین کے مواجہ میں تحقیقات ہوگی" یہ بالکل قانون کے مطابق جواب تھا۔

لیکن چونکہ مجھے یقین تھا کہ ان ملزمین کو عنقریب حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہونے والی ہے، اس لئے دل پر جبر کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا، دس بجتے ہی ڈپٹی صاحب اجلاس پر آئے، کتوں کا ہجوم دیکھ کر مسکرائے، اور فرمایا "اچھا ہمارے نواب صاحب کا کوئی سنگین مقدمہ ہے" میں نے نہایت ادب سے سلام کر کے عرض کی حضور والا خود لاحظہ فرمالیں گے کہ اس غریب پر کیا کیا ظلم توڑے گئے ہیں اس سے زیادہ میں کچھ عرض کر کے عدالت کی رائے پر اثر ڈالنا خلاف قانون و انصاف سمجھتا ہوں۔"

مسٹر کولی نے کھڑے ہو کر کہا" مائی لارڈ اس مقدمہ کا دارومدار محض قانونی مباحث پر ہے۔ کیونکہ اس مقدمہ کے مستغیث اور ہمارے قدیم دوست مولوی اسد یار خانصاحب نے نہ تو گواہوں کی کوئی فہرست استغاثہ کے ساتھ منسلک کی ہے اور نہ کوئی شہادت طلب کی گئی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی محض اپنے بیان اور قانونی مباحث پر اس مقدمہ کا تصفیہ کرانا چاہتے ہیں، اگر یہ صورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے فاضل دوست کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا تو میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ پہلے مقدمہ کے قانونی پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے، تاکہ اگر یہ ثابت ہو کہ ملزمین کے افعال سے کوئی جرم نہیں بنتا تو مقدمہ کو شہادت لسانی لئے بغیر ختم کر دیا جائے۔

ڈپٹی صاحب نے میری طرف دیکھا میں نے عرض کیا۔ مجھے مسٹر کولی کی رائے سے پورا اتفاق ہے، اور میں عدالت کو یاد دلاتا ہوں کہ اگر اپنی تمام عمر میں میرے فاضل دوست نے کبھی کوئی سمجھ کی بات کہی ہے تو آج اور اسوقت کہی ہے۔"

مسٹر کولی، مائی لارڈ! میں امید کرتا ہوں کہ میرے فاضل کو اس طرح میری قانونی واقفیت کی نکتہ چینی کرنے سے روک دیا جائے گا۔"

میں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے فاضل دوست کا دماغ اپنی کمزوری کی طرف رفتہ رفتہ رجوع کر رہا ہے، اگر وہ اپنے آپ کو میری تعریف کے لائق نہیں سمجھتے تو میں نہایت

خوشی سے اپنے وہ الفاظ جوان کی تعریف میں میں نے استعمال کئے تھے واپس لیتا ہوں اور اگر لفظ "فاضل دوست" میں لفظ فاضل کو اپنی توہین خیال فرماتے ہیں تو میں آیندہ سے بجائے "فاضل دوست" کے بیوقوف دوست استعمال کرنے کو تیار ہوں۔

ڈپٹی صاحب۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے عذر گناہ بدتر از گناہ کی صورت اختیار کی ہے، لیکن چونکہ مسٹر کولی اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ مستغیث نے جو کچھ کہا ہے وہ کسی بری نیت سے نہیں کہا۔ اس لئے وہ اس ریمارک سے درگزر کر کے اصل مقدمہ کی طرف رجوع کریں گے۔

مسٹر کولی۔ مائی لارڈ! میں حضور کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میرے موکلین میں سے اکثر کو نابالغ ظاہر کیا گیا ہے، اور میں یقین دلاتا ہوں کہ ان میں سے اکثر جوان ہیں اور اکثر بال بچے والے ہیں۔

میں۔ جناب والا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کتے کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہیں ہوتی اور اس کو میرے فاضل دوست بھی تسلیم کریں گے کہ بارہ سال والی ہر ہستی قانوناً نابالغ سمجھی گئی ہے، ایسی حالت میں میر اکتوں کو نابالغ قرار دینا کسی طرح غلط نہیں ہے، علاوہ ازیں مستغیث دوسرے کے بلوغ یا عدم بلوغ کا پتہ نہیں چلا سکتا، اگر مسٹر کولی اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اپنے بعض موکلین کو نابالغ بیان کرتے ہیں، تو وہ ابھی ٹٹول ٹٹول کر بالغوں اور نابالغوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیں، میں استغاثہ میں صحت کر دوں گا اس سے استغاثہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ وکیل صاحب کی عقل کا ضرور اندازہ ہوتا ہے۔

ڈپٹی صاحب۔ مسٹر کولی آپ اس کا جواب کیا دیتے ہیں۔

مسٹر کولی۔ مناسب ہے کہ استغاثہ کو بحالت موجودہ چلنے دیا جائے۔

میں۔ یہ دوسری سمجھ کی بات ہے جو آج مسٹر کولی کے منہ سے نکلی ہے، اس کے علاوہ جو کچھ انہوں نے کہا اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دماغ اور ان کے اکثر موکلین کے

دماغوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے، جس کا وہ سابق میں اعتراف بھی کر چکے ہیں۔

مسٹر کولی۔ جناب والا میں اس قسم کے ریمارک کا متحمل نہیں ہو سکتا، ممکن ہے کہ اشتعال طبع کی صورت پیدا ہو جائے، اور عدالت کوئی دوسری کارروائی کرنے پر مجبور ہو۔

ڈپٹی صاحب۔ میں مستغیث کو ہدایت کرتا ہوں کہ آئندہ انہوں نے کوئی ایسی بات زبان سے نکالی جو تحقیر عدالت کی حد تک پہنچتی ہو تو میں حسب دفعہ ۴۸۰ ضابطہ فوجداری کارروائی شروع کرونگا،

مسٹر کولی۔ میرے موکلین پر جو تعزیرات ہند کا پہلا جرم قائم کیا گیا ہے۔ وہ نقب زنی ہے میری ابتدائی حجت یہ ہے کہ کتے نقب زنی کا ارتکاب نہیں کر سکتے،

میں۔ یہ حجت بلا دلیل ہے۔ میں یہ کہونگا کہ کتے نقب زنی انسان سے زیادہ سہولت سے کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے سخت پنجے اور ناخن ہیں، اور انسان کے نہیں ہیں۔ ابھی ان کتوں اور مسٹر کولی کو سامنے کی دیوار کھودنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ تو دیکھیں پہلے کتے سوراخ کر ڈالتے ہیں یا مسٹر کولی، دوسرے یہ بحث بھی الٹی کی گئی ہے۔ اور کیوں نہ ہو مسٹر کولی کے دماغ سے ایسی ہی بحث کی توقع کی جا سکتی ہے، استغاثہ میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ کتوں نے دیوار میں سوراخ کیا، میں عرض کرتا ہوں کہ دیوار میں موری پہلے سے موجود تھی اور انسان کی آمد و رفت کے لئے نہیں بنائی گئی تھی بلکہ پنجانے کے پانی کے اخراج کیلئے تھی دفعہ ۴۴۵ ضمن (۲) کے الفاظ یہ ہیں کہ "کسی ایسے راستے سے داخل ہونا جو آمد و رفت کیلئے نہ بنایا گیا ہو" اسلئے کتوں کا موری میں سے آنا حسب دفعہ محولہ یقیناً نقب زنی میں داخل ہے۔

مسٹر کولی۔ اس کا ثبوت کیا ہے؟

میں۔ جناب والا اب میں ثبوت میں کچھ عرض کرونگا تو پھر اعتراض کیا جائیگا اگر اجازت ہو تو جواب دوں،

ڈپٹی صاحب۔ اچھا اجازت ہے،

میں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ موری آمد و رفت کیلئے نہیں بنائی گئی تھی۔ مسٹر کولی اسکا ثبوت طلب کرتے ہیں۔ میں صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ کیا کبھی اس موری سے مولوی قطمیر صاحب میرے مکان میں تشریف لائے تھے۔ یا کبھی ان کے بال بچے اس راستہ سے آتے جاتے رہتے ہیں، اگر ان لوگوں میں سے کوئی نہیں آتا تو ماننا پڑیگا، کہ یہ موری انسان کی آمد و رفت کے لئے نہیں بنائی گئی اور اگر یہ لوگ اس موری میں سے آمد و رفت رکھتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ لوگ انسان نہیں جانور ہیں۔

مسٹر کولی۔ مائی لارڈ! کیا ان الفاظ سے میرے موکل کی توہین نہیں ہوتی۔

میں۔ میں نے پہلے ہی حضور والا سے اجازت لے لی ہے اب اگر مسٹر کولی ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو خود عدالت پر دائر کریں، میں ان کی طرف سے شہادت دینے کو تیار ہوں،

ڈپٹی صاحب۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ موری کتنی بڑی ہے؟

مسٹر کولی۔ اس کے لئے مناسب ہے کہ موقع کا معائنہ کر لیا جائے۔

میں۔ میرے خیال میں بھی اس کی ضرورت ہے۔ اور میں عدالت کو باور کراتا ہوں کہ یہ موری اتنی بڑی ہے کہ کتا تو کتا اگر جناب والا معائنہ کے موقعہ کے وقت مسٹر کولی کی گردن پکڑ کر موری میں ٹھونس دیں تو یہ بھی باوجود اس تن و توش کے پھنس پھنسا کر اس موری سے پار ہو جائیں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرہ پر مسٹر کولی کو بہت تاؤ آگیا، انہوں نے نہایت زور سے میز پر مکا مارا اور کچھ کہنا چاہتے تھے کہ اجلاس کا رنگ ہی بدل گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ مسٹر کولی نے مکا مارتے وقت یہ خیال نہیں کیا کہ میرا ہاتھ میز پر رکھا ہوا ہے۔ بجائے میز پر پڑنے کے مکا میرے ہاتھ پر پڑا، بھلا میرے ہاتھ کی تحقیر عدالت ہوتی اور میں خاموش رہتا، چونکہ میں جانتا تھا کہ مجھے اشتعال طبع ہو جانے کے وجوہ پیدا ہو گئے اور میں دفعہ ۳۰۰ کے مستثنیٰ چہارم میں

آگیا ہوں۔ اسلئے میں نے میز پر کی دوات اٹھائی (خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی تین پاؤ کی تھی) اور اٹھاتے ہی مسٹر کولی کی طرف پوری طاقت سے پھینکی، وہ اس وقت سر جھکائے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے۔ کہ دوات عین ان کی چندیا پر پڑی، چندیا تھی صاف اور چکنی وہاں سے چھٹی، پھسلنے کی وجہ سے اس کا رخ اجلاس کی طرف ہو گیا۔ اور سیدھی ڈپٹی صاحب کی کنپٹی پر بیٹھی، اور چشم زدن میں مسٹر کولی کا سر اور ڈپٹی صاحب کا منھ ہمرنگ ہو گئے ادھر تو اجلاس کے چپراسی اپنی اپنی کمر سے پٹکے کھول کر ڈپٹی صاحب کا منھ پونچھنے کو دوڑے ادھر مسٹر کولی نے جست کی تو میز کے اوپر، وہاں سے کود کر مجھ پر گرنا چاہتے تھے۔ مگر میں پہلے ہی سے اس حملے کیلئے تیار تھا، میز کا ٹ گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بجائے مجھ پر گرنے کے کرسی پر گرے اور کرسی سمیت اپنے بعض موکلین پر آ پڑے جو کتے دبے انہوں نے غل مچایا۔ ان کا ساتھ ان کے یاروں نے دیا، غرض ایک قیامت برپا ہو گئی باہر کے لوگ دوڑے ہوئے آئے کہ دیکھیں اجلاس پر کیا مصیبت نازل ہوئی، ادھر سے یہ کتوں کا غول گھبرا کر نکلا، راستہ میں مڈبھیڑ ہو گئی دو چار تماشائی تو جھپٹ میں آ کر چت ہو گئے بعضوں کی ٹانگیں کتوں نے لیں غرض ..........

نوٹ :- یہاں سے کچھ صفحات غائب ہیں۔
اس کے بعد جو صفحہ شروع ہوا ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے نواب صاحب پر تحقیر عدالت کی کارروائی زیر دفعہ ۴۸۰ ضابطہ فوجداری شروع کر کے انکا جواب لیا جا رہا ہے، سوال کا جو ابتدائی حصہ ہے وہ گم شدہ صفحہ میں ہوگا۔

لہذا

آپ وجہ ظاہر کیجئے کہ کیوں آپ کے خلاف حسب دفعہ ۴۸۰ ضابطہ فوجداری کارروائی کر کے تجویز مناسب نہ کی جائے۔ ۲۸ مئی سنہ ع

شرح دستخط کلب علی خاں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔

یہ کاغذ مجھے دیا گیا۔ میں نے پڑھا، ذرا مسکرایا اور ڈپٹی صاحب سے عرض کی کیا میں زبانی جواب دوں یا تحریری،

ڈپٹی صاحب۔ تحریری۔

میں۔ کیا میں اپنے جواب میں صاف صاف ظاہر کر دوں کہ جو لوگ قانون سے واقف نہیں ان کا کرسی عدالت پر بیٹھنا خود تحقیر عدالت ہے اور جن کا وجود تحقیر عدالت ہو وہ کسی دوسرے شخص پر تحقیر عدالت کا مقدمہ قائم کرنے کے حقدار نہیں ہیں۔

ڈپٹی صاحب۔ آپ کو زبانی گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کا جو جی چاہے وہ اپنے بیان تحریری میں لکھ دیجیے۔

میں نہایت اطمینان سے وہیں کرسی پر بیٹھ گیا بستہ کھول کر قانونی کتابیں نکالیں، دفعات متعلقہ کو دیکھا اور حسب ذیل مسودہ تیار کیا۔

باجلاس عالی جناب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بہادر

کارروائی زیر دفعہ ۴۸۰ ضابطہ فوجداری سرکار ذریعہ کمیٹی ڈپٹی کلب علی خاں صاحب مستغیث، نواب اسد یار خاں بہادر مستغاث علیہ

بعرض ———— عالی ———— مے رساند

گزارش ہے کہ میرا اس کارروائی میں جواب طلب کیا جاتا ہے، لیکن جواب دینے سے پہلے میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ جو طریقہ عدالت نے اختیار کیا ہے وہ سراسر خلاف قانون ہے، تحقیر عدالت ضرور ہوئی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کس کی تحقیر عدالت ہوئی، مجھے اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں ہے اور یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ عدالت کے کمرے میں جو داخل ہوتا ہے وہ خود عدالت کا جز ہو جاتا ہے۔ اگر اس کی یا اس کے کسی حصہ کی تحقیر کی جائے تو وہ عدالت کی عین تحقیر ہے اس لحاظ سے سب سے پہلے تحقیر عدالت بہرے ہاکھو کی مسٹر کوہلی نے کی، اسکے بعد میں نے نہیں بلکہ دوات نے مسٹر

کولی کے سر کی تحقیر عدالت کی۔ اور اسکے بعد مسٹر کولی کے سر نے دا سکو میں آخر میں ثابت کرونگا، ڈپٹی صاحب کی کنپٹی کی تحقیر عدالت کی اور پھر مسٹر کولی نے کتوں کی تحقیر عدالت کی۔ اور کتوں نے تماشائیوں کی تحقیر عدالت کی، ایسی صورت میں تمام اجزا کو ترک کر کے صرف کنپٹی کی تحقیر عدالت کے متعلق کارروائی کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ مقدمہ میں تجزی قانوناً واصولاً ناجائز ہے۔

۲۔ میں نے مسٹر کولی کے دوات ماری اور اس کا مجھے قانوناً حق تھا، ملاحظہ ہو دفعہ ۳۰۰ مستثنیٰ چہارم جس میں محکوم ہے کہ اشتعال طبع کی صورت میں قتل عمد بھی جرم نہیں ہوتا مجھے حق حاصل تھا کہ اجلاس ہی پر مسٹر کولی کا گلا گھونٹ دیتا۔ لیکن میں نے صرف دوات کھینچ مارنے پر اکتفا کیا یہ مسٹر کولی کا قصور تھا کہ وہ اس وقت گردن جھکائے کھڑے تھے اور دوات ان کے سر پر لگی۔ اگر معمولی چندیا ہوتی تو اتنی بھاری دوات سے صرف اتنا ہوتا کہ کھوپڑی ٹوٹ جاتی اور کارروائی وہیں ختم ہو جاتی، یہ کبھی باور نہیں کیا جاسکتا تھا کہ یہ خاص کرپ کے کارخانہ کی بنی ہوئی کھوپڑی ہے، یا گھر میں دباغت ہوتے ہوئے اتنی مضبوط ہو گئی ہے کہ اس پر سے ایسی بھاری دوات بھی پھسل جائے گی اگر دوات پھسلی تو وہ مسٹر کولی کی کھوپڑی کی مضبوطی کا قصور ہے نہ کہ میرا۔ کیونکہ یہ سو اتفاقی کی صورت ہے اور میں دفعہ ۸۰ تعزیرات کی رو سے بری الذمہ ہوں،

۳۔ اب رہا یہ امر کہ دوات کے بجائے سیدھا جانے کے اجلاس کی طرف رخ کیوں بدلا تو اس کا جواب بہت صاف ہے، مسٹر کولی کے سر کی چکنائی اس تبدیل رخ کا باعث ہوئی ہے، ان کی کھوپڑی نہ ایسی چکنی ہوتی اور نہ دوات اجلاس کی طرف جاتی نہ ڈپٹی کلب علیخاں کی کنپٹی پر لگتی اور نہ کنپٹی کی تحقیر عدالت کا مقدمہ قائم ہوتا، ان حالات میں میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ اگر جناب والا کو اپنی کنپٹی کے متعلق تحقیر عدالت کا مقدمہ قائم کرنا ہے تو مسٹر کولی کی کھوپڑی کی چکنائی پر قائم کیا جائے۔ کیونکہ یہی چکنائی اس تحقیر کا باعث

ہوئی، مجھ پر مقدمہ قائم کرنا اور صرف میرا جواب لینا قانوناً صحیح نہیں ہے۔

۴۔ یہاں میں ڈپٹی صاحب کو ایک قانونی صلاح دینا مناسب سمجھتا ہوں گو میں جانتا ہوں کہ ان کے دماغ میں ایسے نازک قانونی نکتہ کا اترنا دشوار ہے مگر بقول سعدی رحمۃ اللہ علیہ ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است  دگر خاموش بنشینم گناہ است

میں ڈپٹی صاحب کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ قانوناً مسٹر کولی کی کھوپری یا اس کی چکنائی پر بھی مقدمہ قائم نہیں ہو سکتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر افعال قدرت کی وجہ سے کسی کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو وہ مجرم نہیں ہوتا، مثلاً ابھی اس مکان کی چھت بیٹھ جائے اور ڈپٹی صاحب دب کر مر جائیں تو نہ کوئی جرم ہو اور نہ اس کے متعلق کوئی مقدمہ قائم ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ قدرت کا فعل ہے اور اس پر کسی کو اختیار حاصل نہیں ہے۔ بجنسہ یہی حالت مسٹر کولی کی کھوپڑی کی ہے ان کی چندیا قدرت نے صاف کر دی ہے (ممکن ہے کہ گھر والوں نے بھی اس صفائی میں کچھ حصہ لیا ہو) اس لئے اگر اس کی وجہ سے دوات کا رخ بدلا تو یہ صورت افعال قدرت میں داخل ہے اور مسٹر کولی جواب دہ قرار نہیں دیئے جا سکتے، البتہ اگر یہ ثابت کیا جا سکے کہ آج خاص اسی غرض سے مسٹر کولی سر منڈوا کر اور تیل مل کر آئے تھے۔ تو وہ یقیناً اپنی کھوپڑی کی چکنائی کے ذمہ دار ہوں گے۔

لہذا استدعا ہے کہ

کارروائی ختم اور مثل داخل دفتر کی جائے، اور چونکہ اپنی درخواست کے فقرہ ۴ میں، میں نے مسٹر کولی کی جانب سے وکالت کی ہے اور ان کو ایک سنگین مقدمہ سے بچا لیا ہے اس لئے مجھے ان سے معقول محنتانہ دلایا جائے۔

نوٹ:۔ مناسب ہوگا کہ عدالت مسٹر کولی کو ہدایت کر دے کہ وہ آئندہ جب

اجلاس پر آئیں تو اپنے سر پر اچھی طرح سینڈ پیپر در یگمال) ملکر آیا کریں تا کہ اس قسم کے واقعات کا ہمیشہ کیلئے سد باب ہو جائے۔ واجب تھا عرض کیا گیا۔

دستخط نواب اسد یار خاں

ڈپٹی صاحب جواب پڑھ کر بہت گھبرائے۔ لیکن بے حیائی بڑا ہی آسرا ہے کچھ سمجھے سمجھائے تو نہیں چار سطر کی ایک تجویز ٹھونک ماری کہ "ملزم کا بیان دیکھا گیا۔ ہماری رائے ہے جو جواب ملزم نے دیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ......

نوٹ:۔ اس کے آگے کے صفحات غائب ہیں۔

غالب بیسنی روٹی کی تعریف کریں تو کریں، میں تو یہی کہوں گا کہ لعنت ہے بیسن اور بیسنی روٹی پر، میرا ہی دل خوب جانتا ہے کہ اس بیسنی روٹی نے مجھے کیا کیا ناک چنے چبوائے ہیں۔ میں نے تو عہد کر لیا ہے کہ زہر کھاؤنگا، مگر بیسنی روٹی کے پاس نہ جاؤنگا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ ابر آیا ہوا تھا، کچھ پھوہار بھی پڑ رہی تھی۔ ہماری ماما جی باورچی خانہ سے مسکراتی ہوئی آئیں اور کہا "میاں کہو تو آج بیسنی روٹی پکالوں" میں نے کہا اچھا پکالو، موسمی چیز ہے، مگر خدا کے لئے کچی نہ رکھنا، ایسا نہ ہو کہ بد ہضمی ہو جائے۔ بڑی بی بولیں "توج میاں ایسی فال زبان سے نہ نکالئے، دور پار، میں کوئی آپ کی دشمن ہوں کہ کچی روٹی کھلا کر دشمنوں کو بیمار ڈالوں گی" یہ کہہ کر جو باورچی خانہ میں گھسی تو اللہ کی بندی نے ایک بجا دیا، میں کھانے والا نو بجے کا، انتظار کرتے کرتے بیزار ہو گیا لیکن روٹیاں نہ آنی تھیں نہ آئیں۔ انہوں نے ڈیڑھ لاکھ قل ہو اللہ کا ختم پورا کیا، جب کہیں خدا خدا کر کے بڑی بی کی شکل نظر آئی، مجھے تاؤ تو بہت تھا، مگر بیسنی روٹیوں کو دیکھ کر ٹھنڈا پڑ گیا، ایسی پتلی پتلی اور سرخ سرخ تھیں کہ دل لوٹ گیا۔ کھانے پر جو ڈٹا تو ناک تک بندوق بھر لی، سچ ہے، چنا اور غلام منہ لگ کر نہیں چھوٹتا۔ اتنا کھایا اتنا کھایا کہ حلق تک آگیا۔ جب دسترخوان صاف ہو گیا تو خدا خدا کر کے اٹھا پانی پیا اور ذرا لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر میں لگی پیاس، اٹھ کر پانی پیا، پھر پیا، لیکن پیاس تھی کہ کسی طرح نہ بجھتی تھی پیٹ پھول کر نقارہ ہوگیا، اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، باہر نکل کر کیا دیکھتا ہوں کہ ڈپٹی کلب علی خاں صاحب کھڑے ہیں۔ یہ اکثر میرے غریب خانہ پر تشریف لانے لگے تھے۔ جب کوئی پیچیدہ قانونی مسئلہ پیش آجاتا تو حل کرنے اکثر میرے پاس آجاتے تھے، خیران کو ساتھ لے دیوان خانہ میں جا بیٹھا سامنے میز پر "رسالہ نمائش" رکھا تھا وہ انھوں نے اٹھا لیا اور اس کے دیکھنے میں محو ہو گئے۔ میرے پیٹ کی بری حالت تھی، بس پھٹنے کے قریب تھا، کسی طرح چین نہ آتا تھا آرام کرسی پر میں نے بہت بہت پہلو بدلے، ٹانگیں کرسی کی دستیوں پر پھیلا کر سہولت راہ پیدا کی، توند کچھ سہلایا۔ کچھ دبایا۔ مگر باوجود اس قدر کوششوں کے ایک بھی امر باعث ندامت صادر نہ ہوا، اسی جدوجہد میں آنکھ لگ گئی کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے غدار شہر میں جارہا ہوں، سڑکیں صاف ستھری اور ستھری ہیں، مگر گلیاں پتلی مکان خوشنما اور خوبصورت ہیں، مگر نیچے نیچے بازاروں میں خوب چہل پہل ہے، ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف ہے، بعض بے فکرے کوٹ پتلون پہنے، سگرٹ منھ میں دبائے لکڑی ہلاتے سرگشت کر رہے ہیں، بیچوں بیچ شہر میں ایک عالی شان عمارت ہے، طالب علم بستے بغل میں دبائے اس میں چلے جا رہے ہیں مجھے بھی شوق ہوا، دل میں کہا چلو، چلتے چلتے یہاں کا طریقہ تعلیم بھی دیکھ لیں، اندر گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ سیکڑوں طالب علم اکڑوں بیٹھے، کتابیں اگلے پنجوں پر رکھے، پروفیسر صاحب کا لکچر سن رہے ہیں، اب جو میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان سب کی شکلیں انسانوں کی بہ نسبت کتوں سے زیادہ ملتی جلتی ہیں پروفیسر صاحب کی ہیئت کذائی دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی، اگر کوئی جاندار ان کے ہم شباہت ہونے کا دعوی کر سکتا ہے تو وہ صرف خارشتی لیبڈر کتا ہے، ان کی مختصر ناک پر بڑے بالوں اور سیاہ کمانیوں کی فیشن ایبل عینک عجیب بہار دے رہی تھی۔

سیاہ کوٹ پتلون زیب تن تھا، پشت کی طرف پتلون کا ابھار ظاہر کر رہا تھا کہ زبردستی

کسی چیز کو موڑ کر اندر دبا دیا گیا ہے، کوٹ کے اوپر سیاہ گون اور سر پر پھندنے دار چوکونی ٹوپی تھی، وہ اس وقت علم ارتقا پر لکچر دے رہے تھے، جس وقت میں داخل ہوا تو وہ فرما رہے تھے "جو ہستی فطرت کے اصول کو تبدیل کر سکے اس کو حق حاصل ہے۔ کہ اشرف المخلوقات کا لقب اختیار کرے، فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر جاندار مار پڑنے پر چیخے چلائے اور آنسو بہائے، سوائے کتوں کے آپ ایک جاندار بھی ایسا نہیں بتا سکتے جو اس اصول مقررہ پر کار بند نہ ہوتا ہو، کتے ہی وہ قابل قدر ہستی ہیں جو اس اصول فطرت کے تابع نہیں ہیں، وہ مار کھانے پر چیخنے اور رونے کے بجائے واہ واہ، واہ، وا کے نعرے لگاتے ہیں، اور اس طرح تعریفوں سے مارنے والے کا دل بڑھاتے ہیں، فطرت کا دوسرا مسلّمہ اصول یہ ہے کہ زمانہ کی ٹھوکریں بڑے بڑے ٹیڑھوں کو سیدھا کر دیتی ہیں، لیکن تجربہ بتا رہا ہے کہ بارہ برس تک ہماری دم زمین میں دبائی گئی پھر بھی وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہی، اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ کتے ہی اشرف المخلوقات کا لقب اختیار کرنے کے مستحق ہیں، چنانچہ بعض عاقل اور سمجھدار انسانوں نے اپنے سے کتوں کو افضل مانا اور تسلیم کیا ہے،

(یہاں سے کچھ حصہ غائب ہے)

علم کتوں کا شیوہ ہے اور متانت ان کا شعار" کتوں کی اتنی تعریفیں سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی مجھ سے نہ رہا گیا، اور میں نے چیخ کر کہا۔" ابے کتے کے بچے! اپنے میاں مٹھو! تم کتے تھے، کتے ہو اور ہمیشہ کتے ہی رہو گے"۔ پروفیسر صاحب نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ان کو ایک غیر جنس نظر آیا، اپنی ساری متانت بھول گئے کرسی پر قلانچیں مارتے، میری طرف لپکے، ان کے ارادہ کا اندازہ کر کے میں دروازہ کی طرف بھاگا۔ میں آگے اور وہ پیچھے، دروازہ قریب تھا۔ میں نکل یہ جا وہ جا، مگر وہ بھی خالی ہاتھ نہ گئے، میرے پائنچوں کے حد اتصال کا کچھ حصہ اپنے منہ میں لے گئے وہ سمجھے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی، میں سمجھا چلو جان بچی لاکھوں پائے، فی الحال میانی نہ شد

نہ سند، گھر جاکر دوسری ڈلوالیں گے۔

اس کے بعد کا کچھ حصہ غائب ہے۔

بازار میں ٹہل رہا تھا کہ چند کتے پولیس والوں کا لباس پہنے گلے میں پٹے اور زنجیریں ڈالے میری طرف آئے، ایک نے جو ان کا افسر معلوم ہوتا تھا اپنا پنجہ میری پیٹھ پر رکھا اور کہا "آپ کو قتل عمد کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے" میں نے کہا کہ "میں نے کسی کو قتل نہیں کیا" اس نے جواب دیا کہ "اس وقت آپ جو کچھ بیان کریں گے وہ آپ کے خلاف شہادت میں استعمال کیا جا سکے گا" چونکہ یہ قانونی حملہ تھا اس لئے میں خاموش ہو گیا ایک نے اپنی گردن میں سے پٹہ اور زنجیر کھولی پٹہ میری گردن میں ڈال دیا اور زنجیر افسر کے ہاتھ میں دیدی، میں نے چلنے میں ذرا ہچر مچر کی تو اس کے ساتھ والوں نے بھونکنا اور منھ مارنا شروع کیا، خلقت کا اژدہام ہو گیا، کتوں کا یہ مجمع خلاف قانون دیکھ کر میرے اوسان باختہ ہو گئے، ہمت نے جواب دیدیا، اور میں کان دبائے ان کتوں کی پولیس کے ساتھ ہو گیا، پہلے یہ مجھ کو اسٹیشن ہاؤس پر لے گئے وہاں سے ایک دفتر مثلوں کا نکالا" اور دو چار کانسٹبلوں کو مدعیوں اور گواہوں کو بلانے بھیجا، دس بجتے ہی مجھ کو عدالت میں لے گئے، اور ملزمین کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا، اندر جاکر کیا دیکھتا ہوں کہ تمام کمرہ کتوں سے بھرا ہوا ہے، تل دھرنے کو جگہ نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ میری گرفتاری کی خبر نے یہ مجمع کثیر جمع کر دیا تھا، اجلاس پر ایک بڑا زبردست بلڈاگ بالدار ٹوپی ڈوگ) پہنے ناک کی پھنگ پر عینک رکھے، سرخ گون زیب تن کئے بیٹھا ہے، سامنے ایک لمبی میز پر دونوں جانب وکلا کی قطار ہے یہ رنگ دیکھ کر میری آنکھوں میں ڈپٹی کلب علی خاں کے اجلاس کا نقشہ پھر گیا، گو اس مجسٹریٹ کی شکل بالکل توان سے ملتی نہ تھی، لیکن دونوں میں مشابہت ضرور تھی مجسٹریٹ صاحب نے بہت غرا کر کہا... کیا ملزم حاضر ہے، پیرو کار سرکار اٹھے، کیا کہوں عین مین مسٹر کولی معلوم ہوتے تھے، اگر فرق ہوگا تو بس

انیس بیس کا ہوگا، انہوں نے پہلے اپنی طرف دیکھا، پھر اجلاس کی طرف دیکھا، عینک ٹھیک کی گون کی ایک پٹی کو انگلی پر لپیٹا گردن جھکائی، پھر اٹھائی، پھر جھکائی اور کہا

پیروکار سرکار۔ جناب والا ملزم حاضر ہے، اس پر وارنٹ کی تعمیل باقاعدہ طور پر ہوئی ہے اور اس کے خلاف جس قدر چالان ہیں وہ بالکل تیار ہیں، مدعی بھی حاضر ہیں اور گواہ بھی موجود ہیں۔

مجسٹریٹ :۔ مسٹر ٹوبی اس وقت کتنے مقدمات ایسے ہیں جن کی تکمیل آج کی جا سکتی ہے

مسٹر ٹوبی۔ مائی لارڈ! یوں تو ملزم کے خلاف ہزارہا مقدمات ہیں لیکن اس نے اکثر ایسے موقعوں پر اور اس طرح ہمارے بزبھائیوں کو ہلاک کیا ہے کہ ان کے متعلق کوئی گواہ ہم کو ہمدست نہ ہو سکا، لیکن پھر بھی اس وقت ڈیڑھ سو مقدمات ایسے تیار ہیں جن میں مکمل شہادت پولیس کو فراہم ہو چکی ہے اور انہیں کی تحقیقات میں جناب والا کے اجلاس پر کرانا چاہتا ہوں مجسٹریٹ نے میری طرف دیکھا اور کہا کہ "تم ان مقدمات کی خود پیروی کروگے یا کوئی وکیل مقرر کرنا چاہتے ہو،،

میں۔ جناب والا میں اپنے مقدمات میں خود پیروی کرتا ہوں، لیکن میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے، میں کس کے قتل کے الزام میں ماخوذ کیا گیا ہوں اور آپ کو ان مقدمات کی سماعت کا اختیار کیسے حاصل ہوا ہے، اگر کسی کتے کو کتے نے مارا ہوتا تو البتہ اس مقدمہ کی سماعت اس اجلاس پر ہو سکتی تھی۔ مگر جب کسی مقدمہ میں کوئی انسان ملزم قرار دیا گیا ہو تو اس کی سماعت انسانی عدالت میں ہو سکتی ہے،

مسٹر ٹوبی۔ مائی لارڈ، ملزم کا استدلال صحیح نہیں ہے، میں ملزم کی اس حجت کے باضابطہ فضول داخل عدالت کرتا ہوں، جو اس نے ڈپٹی کلب علی خاں صاحب کے اجلاس پر کی تھی، جب انہوں نے بہ حیثیت مستغیث کتوں کو ملزمین قرار دیکر انسان کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا تھا تو کوئی وجہ نہیں ہوتی کہ وہ مقدمات جن میں کتے مستغیث اور یہ ملزم ہیں

کتوں کی عدالت میں کیوں سماعت نہ کئے جائیں۔

میں، اگر اس بحث کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو مجھ کو یہ عذر ہے کہ چونکہ ہلاکت انسانوں کی عدالت کے حدود اختیاری میں واقع ہوئی ہے، اس لئے ان مقدمات کی سماعت حسب دفعہ (۱۸۰) ضابطہ فوجداری ہند موجودہ اجلاس پر نہیں ہو سکتی۔

مسٹر ٹوبی، شاید ملزم کو دفعہ (۱۸۰) ضابطہ فوجداری ہند کے اس جزو کا خیال ہے جس کی رو سے مقدمات قتل کی تحقیقات صرف اسی عدالت میں ہو سکتی ہے جس کی حدود میں ہلاکت واقع ہوئی ہو، لیکن ملزم پر یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں ضابطہ فوجداری ہند نہیں بلکہ ضابطہ فوجداری کلاب نافذ ہے اور اس کی جو دفعہ اس کارروائی سے متعلق ہے وہ دفعہ (۱۸۱) ضمن ا ضابطہ فوجداری ہند کے مسائل ہے، اس میں مرقوم ہے کہ مقدمات قتل کی تحقیقات نہ صرف اس عدالت میں ہو سکتی ہے جہاں ہلاکت واقع ہوئی ہو بلکہ اس عدالت میں بھی ہو سکتی ہے جہاں ملزم پایا جائے میں۔ مگر ضابطہ فوجداری کلاب انسانوں سے متعلق نہیں ہو سکتا۔

مسٹر ٹوبی۔ اس کے دو جواب ہیں، ایک عقلی دوسرا نقلی، جس عدالت میں مقدمہ کی تحقیقات کی جائے اس میں وہی قانون استعمال کئے جائیں گے جو وہاں کی مجلس وضع قوانین نے نافذ کئے ہوں، میں اوپر ثابت کر آیا ہوں کہ ملزم کے خلاف جو مقدمات ہیں ان کی تحقیقات اسی عدالت نہیں ہو سکتی ہے۔ اس لئے اسی ملک کے نافذہ قانون ان مقدمات کے انفصال میں استعمال ہوں گے، دوسری بحث کے متعلق میں ملزم کے ان استغاثوں کی باضابطہ نقول داخل کرتا ہوں جو اس نے اپنے ملک کی عدالت میں پیش کئے تھے، وہاں اس نے کتوں پر تعزیرات ہند کے الزامات لگائے ہیں، جب انسان کی عدالت میں کتوں کی تحقیقات تعزیرات ہند کی رو سے ہو سکتی ہے تو میں کوئی وجہ نہیں پاتا کہ کتوں کی عدالتوں میں انسان کی تحقیقات خود کتوں کے قوانین نافذہ کے تحت کیوں نہ کی جائے

مجسٹریٹ، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ملزم اپنے دشمنوں کے ملک میں اپنی خوشی سے کس طرح آگیا۔

مسٹر ٹوبی، مائی لارڈ، یہ ہمارے ملک کی پولیس کا ایک روشن کارنامہ ہے۔ ان مقدمات کے مفتش کیلئے سب سے اہم اور مشکل کام ملزم کی گرفتاری تھا لیکن ملزم کی ماما کی اعانت اور ہمارے وارنٹ نے جو بیسنی روٹی کی شکل میں نافذ ہوا تھا، اس کو بآسانی ہمارے قبضہ میں پہنچا دیا۔

یہ سن کر مجھے بہت تاؤ آیا اور میں نے عہد کر لیا کہ اگر بخیر و خوبی اس مخمصہ سے نجات پائی تو گھر جا کر بڑھیا کا گلا ہی گھونٹ دوں گا، رہی بیسنی روٹی تو وہ آئندہ نہ میں خود کھاؤنگا نہ حتی المقدور دوسروں کو کھانے دوں گا۔ بس سمجھ لو کہ اس وقت تو صرف گیہوں سے دشمنی تھی، آج سے چنے سے بھی بیر ہے۔

مجسٹریٹ۔ مسٹر ٹوبی آپ اپنا سب سے مضبوط مقدمہ پیش کیجئے تاکہ ملزم پر اگر جرم ثابت قرار پائے تو اس کی تجویز موت کے ساتھ بقیہ کل مقدمات کا خود بخود خاتمہ ہو جائے۔

مسٹر ٹوبی۔ مائی لارڈ! میں اس قیمتی مشورہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور سب سے پہلے مولوی قطمیر صاحب کے کتے کے قتل عمد کا مقدمہ شروع کرتا ہوں۔

مسٹر ٹوبی نے مقدمہ کے واقعات تفصیل سے بیان کئے اور جس طرح پتھر کے لگنے سے اس کتے کی موت واقع ہوئی تھی، اس کی صراحت کرنے کے بعد کہا کہ مائی لارڈ میں اپنی بحث کے آخر میں ثابت کرونگا کہ قتل عمد کے لئے لازم نہیں ہے کہ ملزم خود اپنے ہاتھ سے کسی کی ہلاکت کا باعث ہو، بلکہ صورتوں میں ملزم کے ایسے افعال بھی جو بظاہر جرم نہ معلوم ہوتے ہوں اس کو جرم قتل عمد کے تحت میں لے آتے ہیں۔ اس قدر بحث کے بعد اب میں مقدمہ میں شہادت پیش کرتا ہوں، اس مقدمہ کا پہلا گواہ وہی مفتش ہے جسکی کارگذاری بالآخر اس ملزم کی گرفتاری کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے، گواہ کو آواز دی گئی، اس نے

گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر حلف لیا، جس کو میں نہ سمجھ سکا اس لئے میں نے اعتراض کیا کہ "حلف اس طرح اور اس طریقہ سے ہونا چاہیئے کہ جس سے ملزم کو اطمینان ہو جائے کہ گواہ سچ بول رہا ہے۔

مجسٹریٹ۔ حلف کا یہ اصول صحیح نہیں ہے، چونکہ عدالت گواہ کے سچے یا جھوٹے ہونے کی تنقید کرتی ہے، اس لئے حلف اسی طرح اور اسی طریقہ سے لیا جاتا ہے جس سے عدالت مطمئن ہو جائے کہ جو کچھ اس کے سامنے بیان کیا جا رہا ہے وہ قابل اعتبار ہے مفتش نے واقعات مقدمہ بیان کئے، اور آخر میں میرے طریقہ گرفتاری پر روشنی ڈالی اس سے معلوم ہوا کہ، میری ماما کتوں کی بڑی شوقین تھی اور ایک کتے سے جو در اصل مفتش مقدمہ تھا اس کو بڑی محبت ہو گئی تھی، اس کتے نے رفتہ رفتہ اپنے طرز عمل سے اس بڑھیا پر ثابت کیا کہ اس کو بیسنی روٹی کا بہت شوق ہے، چنانچہ چند روز تک وہ بڑھیا چرا چھپا کر اس کتے کو بیسنی روٹی کھلاتی رہی ایک دن اس نے مجھے بھی بیسنی روٹی، کھلانے پر آمادہ کیا، تاکہ بچے ہوئے ٹکڑوں سے اس کتے کا بھی کھانا نکل آئے، یہ وہ جال تھا جس میں مجھے پھنسایا گیا، اور میں عدم واقفیت کی وجہ سے اس مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔

مفتش کے ابتدائی بیان کے بعد میں نے اس پر جرح کرنی چاہی تو اس پر مسٹر ٹوبی نے کہا کہ اس عدالت میں کسی گواہ پر جرح کی اجازت نہیں دی جاتی اور نہ ہمارے قانون شہادت میں جرح کی کوئی دفعہ قائم کی گئی ہے۔

میں۔ لیکن قانون شہادت ہند کی رو سے کوئی بیان قابل ادخال شہادت نہیں ہو سکتا۔ جب تک فریق ثانی کو اس پر جرح کا موقع نہ دیا گیا ہو،

مجسٹریٹ۔ جرح اس لئے کی جاتی ہے کہ گواہ کی سچائی کا امتحان ہو سکے جب ایک گواہ حلف لیکر کچھ ظاہر کرے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بیان کو سچ کیوں نہ سمجھا جائے۔

مسٹر ٹوبی۔ مائی لارڈ، ملزم ان لوگوں کے قانون کا حوالہ دے رہا ہے جو حلف لیکر بھی

جھوٹ بولنے میں تامل نہیں کرتے، اور جو حلف کی وقعت کو نہیں سمجھتے جناب والا کا ارشاد بالکل صحیح ہے، یا تو گواہ کو حلف نہ دیا جائے، اور اس کی صداقت کا امتحان بذریعہ جرح کیا جائے۔ یا اس کو حلف دیا جائے تو اس کے بیان پر بلا جرح اعتبار کرنا چاہیئے

مجسٹریٹ۔ دوسرے گواہ کو بلایا جائے۔

آواز دی گئی اور ایک سفید چادر میں لپٹی ہوئی عورت کٹھرے میں داخل ہوئی، میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا، کہ یہ میری چیا ہنی بلی ہے۔ غضب ہے جسکو میں جان کے برابر رکھتا تھا، وہی آج میرے خلاف شہادت دینے آکھڑی ہوئی، سچ ہے بلی کی ذات بڑی بیوفا ہوتی ہے

گواہ نے مسٹر ٹوبی کے سوالات کے جواب میں یہ حلف بیان کیا کہ میں ملزم کے پاس ایک عرصہ سے رہتی ہوں، ان کے مکان سے ملا ہوا مولوی قطمیر کا مکان ہے ملزم کے مکان کے بیچانے کی موری، مولوی صاحب کے مکان میں نکلتی ہے، تقریباً چھ ماہ کا عرصہ ہوا ہوگا کہ......

(آگے کے صفحات غائب ہیں، جس میں گواہوں کے بیانات، بحث اور فیصلہ کا بڑا حصہ ہوگا کیونکہ جو صفحہ اس کے بعد کا ہے وہ فیصلہ کے جزو آخر سے شروع ہوتا ہے)

بہرحال شہادت پیش شدہ سے موری کے عین اوپر کی منڈیر پر پتھر کا رکھنا پتھر سے رسی باندھ کر اس کا دوسرا سرا موری کے سامنے کیل سے لپیٹ دینا۔ مولوی قطمیر صاحب کے کتے کا موری میں سے نکلنے کی کوشش کرنا، اس کوشش کرنے میں رسی کا اس سے ٹکرانا اور پتھر کا اوپر سے گر کر اس کو ہلاک کرنا پوری طرح ثابت ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ملزم کے ایسے افعال کا مجموعہ جو فرداً فرداً جرم نہ ہوں اسکو قتل عمد کا مجرم قرار دے سکتا ہے یا نہیں، اس بارے میں ٹوبی نے نہایت لیاقت سے بحث کی ہے اور عدالت کو ان کی حجت سے پورا اتفاق ہے، اگر ملزم جاننے بادر کرنے کی وجہ

رکھتا ہو کہ اس کے افعال سے ہلاکت واقع ہونے کا احتمال ہے یا غالباً اسکا نتیجہ ہلاکت ہے یا وہ افعال حسب طبیعت معہودہ جانداران ہلاکت کے لئے کافی ہیں تو ملزم کے ایسے افعال اس کو جرم قتل عمد کے تحت میں لے آئیں گے، اور جیسا کہ ہم شہادت سے بحث کرتے ہوئے ثابت قرار دے چکے ہیں کہ ملزم کو یہ معلوم تھا کہ مولوی قطمیر صاحب کا کتا اس موری سے آمد و رفت رکھتا ہے تو اس کا ایسا بڑا پتھر اس طرح منڈیر پر رکھنا اور اس کا سلسلہ رسی سے اس طرح قائم کرنا کہ موری سے آنے جانے والے کی ذرا سی ٹھیس سے وہ گر سکے اور بلحاظ اپنی جسامت کے ایک بڑے سے کتے کے ہلاک کرنے کو کافی ہو تو اس کے افعال بدنیتی پر دلالت کریں گے اور اس کا قانونی نتیجہ یہی نکلے گا کہ ملزم نے وہ افعال اس نیت سے کئے تھے کہ مولوی قطمیر صاحب کے کتے کی ہلاکت واقع ہو۔

ان تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میں ملزم پر جرم ثابت قرار دیتا ہوں اور چونکہ ورثائے مقتول خواہان قصاص ہیں،

لہٰذا حکم ہوا کہ

ملزم کتے مار خاں کو بپاداش جرم قتل عمد ہلاک کیا جائے۔ اور ایک درجن کتے اس کے پیچھے اس غرض سے چھوڑے جائیں کہ وہ ملزم کو اس وقت تک کاٹیں اور بھنبوڑیں کہ اس کی جان جسم سے نکل جائے، ملزم کی تمام جائیداد ضبط کی جائے حسب دفعہ ۵ لم ۵ ضابطہ فوجداری ورثائے مقتول میں تقسیم کردی جائے۔

(دستخط مسٹر بل ڈاگ سیشن جج کتا نگر)

نوٹ :- فیصلہ کی فوراً تعمیل کی جائے۔

میں۔ مگر جناب والا مجھے مرافعہ کا حق حاصل ہے، اور ابھی اس فیصلہ کا نفاذ لوکل گورنمنٹ کی منظوری کا محتاج ہے۔

مجسٹریٹ۔ یہاں مرافعہ کا نہ کوئی قاعدہ ہے اور نہ لوکل گورنمنٹ کی منظوری کی ضرورت ہے ان ممالک کا دستور ہے جہاں گواہوں کے بیانات پر اعتبار نہ کرنے کی وجہ ہوتی ہے، چونکہ ہماری عدالتوں میں کوئی گواہ حلف لیکر جھوٹ نہیں بولتا اس لیے شہادت سے صرف ایک ہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے، اور اسی لیے یہاں کوئی عدالت مرافعہ قائم ہی نہیں کی گئی، اور نہ لوکل گورنمنٹ کو عدالتی کارروائیوں میں کوئی دخل ہے۔

(پولیس والوں کی طرف دیکھ کر)

مجرم کو مقتل میں لے جاؤ،

مجسٹریٹ کا حکم سنتے ہی پولیس والے کشاں کشاں مجھے ایک بڑے میدان میں لے گئے، اس میدان کے چاروں طرف اونچے اونچے کٹہرے تھے۔ تمام شہر اس قتل کا تماشا دیکھنے امنڈ پڑا تھا کٹہرے کے گرد کتوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ تھے۔ جہاں تک نظر جاتی تھی کتے ہی کتے نظر آتے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ میرے جلادوں میں خود مجسٹریٹ صاحب بھی شریک ہیں، میری غیرت کو حرکت ہوئی اور میں نے ٹھان لی کہ مرنا برحق ہے مگر مرتے مرتے دو چار کتوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ مجھے میدان میں ان جلادوں سے کوئی دس قدم آگے کھڑا کیا گیا، ایک کتا میدان میں جھنڈی لے کر آیا۔ جب اس نے دیکھا کہ سب مستعد ہو گئے تو ایک دفعہ ہی اس نے جھنڈی گرائی۔ اور میری موت و زیست کی دوڑ شروع ہوئی، میں نے بھی وہ وہ چکر دیئے اور وہ وہ پلٹیاں لیں کہ بہت سے کتوں کی کمریں توڑ دیں، جو کوئی قریب آیا اس کو دو چار لاتیں رسید کیں۔ کسی کو اٹھا کر دے پٹکا۔ کسی کی گردن دبا کر چھوڑ دیا غرض یہ کہ، جتنے کتے تھے وہ تھک کر بیٹھ رہے، اور میدان میں صرف مجسٹریٹ صاحب اور میں رہ گئے، اب میری بھی ہمت بڑھی اور میں نے للکار کر کہا کہ :-

" حرامزادہ مجسٹریٹ اب دیکھ تجھے مجسٹریٹی کا مزا چکھاتا ہوں، بڑا کلب علی خاں

کا باوا بن کر اجلاس پر بیٹھا تھا۔ آج چھٹی کا دودھ یاد نہ دلایا ہو تو میرا نام کتے مار خاں نہیں"
یہ کہتے ہوئے میں مجسٹریٹ کی طرف جھپٹا۔ ادھر سے وہ بڑھا، ادھر سے میں بڑھا دونوں دست و گریباں ہو گئے، میں نے اس کی تھوتھنی پکڑی اس نے میرے منہ پر پنجہ مارا، میں نے اس کو نوچا اس نے مجھ کو نوچا، میں نے اس کو گرایا۔ اس نے مجھے دے مارا، میرے کپڑوں اور اس کی کھال کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ دونوں لہو میں تر بتر تھے، لیکن نہ میں اس کی گرفت چھوڑتا تھا اور نہ وہ پیچھے ہٹتا تھا، میں نے دیکھا کہ جتنا وقت گزرتا جاتا ہے میرے قویٰ مضمحل اور میرے ہاتھ پاؤں جواب دیتے جاتے تھے اس خونخوار کتے نے بھی میری کمزوری کو محسوس کر لیا، اور آخری حملہ کے لئے اپنی تمام قوت صرف کر کے اپنے پنجے میری گرفت سے چھڑا لئے، چھڑانے کے ساتھ ہی اس نے میری گردن دبائی میرا سانس رکنے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے ایک چیخ ماری اور چیخ کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی، دیکھتا کیا ہوں کہ میں نیچے پڑا ہوں، اور ڈپٹی کلب علی خاں صاحب میرے سینہ پر سوار میرا ٹینٹوا دبا رہے ہیں۔ ان کی داڑھی اور میری مونچھوں کے کچھ اجزا میں تبادلہ ملکیت ہو گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ عالم خواب میں مجسٹریٹ کے متعلق جو الفاظ میں نے کہے تھے ان کا مخاطب ڈپٹی صاحب نے اپنے آپ کو سمجھا، اس کے بعد جب میں اٹھ کر جھپٹا تو وہ بھی غصہ میں آپے سے باہر ہو کر میرے سے لپٹ گیا۔

پھر جو کچھ ہوا وہ ہوا، اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، ہم دونوں کی حالت اس کا آئینہ تھی،

میری چیخ سے ڈپٹی صاحب کے چپراسی بھی دالان میں آ گئے اور یہ تماشہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ ایک نے بڑی مشکل سے ڈپٹی صاحب کو مجھ سے علیحدہ کیا اور وہ یہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے کہ :۔

"بازی بازی بار یش بابا ہم بازی"

میں نے کہا کہ :-

ڈپٹی صاحب آپ کو یہ کیا وحشت ہو گئی تھی کہ :-

(یہاں سے پھر صفحات غائب ہیں)

# کل کا گھوڑا

جناب اڈیٹر صاحب رسالہ نمائش

السلام علیکم، آپ جانتے ہیں کہ آجکل کی نئی پود نے ملک کی بہبودی کے لئے ڈاکہ کو جائز قرار دیا ہے، چنانچہ بنگالہ کی حالت اس کی کھلی ہوئی مثال ہے اگر یہ اصول صحیح ہے تو میں بھی "ہیچ کہیں بلی تو بلی ہی سہی" کے مقولہ پر عمل کر کے اردو کی طرف انگریزی ادب پر ڈاکہ ڈالتا ہوں، لیکن مال کی ہیئت تبدیل کرنے کے لئے بہت کچھ کتر بیونت کر دیتا ہوں تاکہ شناخت کی وجہ سے ڈاکہ کا الزام عائد نہ ہوسکے۔ اگر چوری کا مال خریدنے اور نکاسی کرنے کی ہمت ہے تو بسم اللہ، نمائش میں کسی جگہ جا دیجیے۔ ورنہ واپس فرما دیجیے خدا کے فضل سے دنیا میں مال مسروقہ خریدنے والوں کا توڑا نہیں۔ مال کھرا ہے، میں کہیں اور دام کھرے کرلوں گا، دیکھئے ایک راز کی بات بھی کہے دیتا ہوں، کسی سے کہیئے گا نہیں اس مضمون کا کچھ خاکہ جون سنہ ۱۹۰۹ء کے پیپرسنز میگزین سے اڑایا گیا ہے، لیکن اضافہ واقعات اور طرز ادا نے دونوں مضمونوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا ہے۔ کوئی بے وقوف سے بے وقوف بھی نہ کہے گا کہ یہ مال فلاں مال کو گلا کر بنایا گیا ہے۔ پیپرسنز میگزین بھی اس کے ساتھ بھیجتا ہوں آپ مقابلہ کر کے اپنی عقل کا اندازہ لگا لیجیے۔ والسلام

دکمترین مرزا الم نشرح)

موجد دنیا میں سیکڑوں ہیں اور ہوتے چلے آئے ہیں، مگر توبہ توبہ خدا کسی کو میرے دوست مسٹر مور جیسا موجد نہ کرے، بندہ خدا کو دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا تھا جب دیکھو اپنے دار التجربہ میں بیٹھے ہیں۔ جب جاؤ اس کو توڑ اس کو جوڑ رہے ہیں،

بیٹھے بیٹھے آندھی آجاتی تھی۔ مگر وہ اللہ کا بندہ یہ بھی نہیں پوچھتا تھا کہ میاں خیریت سے تو ہو۔ ہزاروں ایجادوں سے دنیا کو مالامال کر دیا۔ لیکن یہ بھی نہ سمجھے کہ دنیا ہے کیا اور دنیا میں کیا ہو رہا ہے، جنگ عظیم میں ان کی بیسیوں ایجادیں کام میں لائی گئیں، لیکن ان کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ جنگ کب چھڑی! کیوں چھڑی! کون جیتا! کون ہارا، ایک دن میں نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ اس لڑائی میں بلجیم نے اپنی بساط سے بہت زیادہ ہمت دکھائی، پوچھنے لگے کہ یہ مسٹر بلجیم کون صاحب ہیں اور کہاں رہتے ہیں، بھلا ایسوں کی صحبت سے کسی کا کیا دل بہل سکتا ہے،

میں تو ٹھہرا بیوپاری کہ پیسوں کے لئے مردے کا کفن بھی اتروالوں، اور مسٹر مور ٹھہرے ایسے بے پروا کہ اپنی کسی ایجاد کی رجسٹری تک نہ کروائی، میں نے کئی دفعہ کہا بھی تو یہی جواب ملا کہ ہر ایجاد عامہ خلائق کے فائدہ کے لئے ہے، کسی خاص شخص کا حق نہیں ہے، اور نہ ٹکے پیدا کرنے کے لئے ہے، ایک دوربین ایجاد کی تھی گھر کے باہر سے گھر کے اندر کا حال دکھائی تھی۔ لیکن میرے یار نے اس کی بھی رجسٹری نہ کرائی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کارخانہ نے اپنے نام سے اس کی رجسٹری کرا کے لاکھوں روپیہ کھرے کر لئے، جب میں نے مور سے اس کا ذکر کیا تو وہ یہ بھی نہ سمجھے کہ اس کارخانہ پر ہرجے کا دعوی ہو سکتا ہے، بہرحال مور کی ایجادات دریا کی لہریں تھیں کہ یکے بعد دیگرے پیدا ہوتی تھیں اور بغیر ان کو فائدے پہنچائے ان کی حد تک فنا ہو جاتی تھیں، گو دوسرے ان سے پوری طرح متمتع ہوتے تھے۔ اگر باپ دادا نے جائداد نہ چھوڑی ہوتی تو میرے یار کبھی کے محتاج خانہ پہنچا دیئے گئے ہوتے، ان کی ذات سے سب ہی کو فائدہ پہنچتا تھا، نہ پہنچتا تھا تو مجھ کو، کیوں کہ مجھے خبر تک نہ ہوتی تھی کہ ان کی کوئی تازہ ایجاد کب مکمل ہوئی اور کب نصیب دشمناں ہو گئی، خود مور سے تو اس کی توقع رکھنی ہی فضول تھی کہ وہ اس کا ذکر مجھ سے کرتے، اگر حال کھلتا تو اخباروں سے اور اب چھپائے کیا

ہوت ہے، جب چڑیاں چگ گییں کھیت" کی مثل ہمیشہ مجھ پر صادق آتی تھی، اگر میری مالی حالت اچھی ہوتی تو میں بھی پروانہ کرتا، لیکن کاروبار کے مندے اور اکثر بیوپاریوں کی نادہندی نے مجھ کو کھک کر دیا تھا، ایسی صورت میں آپ ہی انصاف کیجئے کہ اپنے سچے مگر حاجت مند دوست کے ساتھ مور کی یہ بے اعتنائی قابلِ شکایت ہے یا نہیں، ایک دن میں پریشانی کی حالت میں دفتر سے سیدھا مور کے ہاں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے دارالتجربہ میں کچھ کام کر رہے ہیں وہیں چلا گیا، اس روز ان کی طبیعت کچھ بشاش معلوم ہوتی تھی، میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر پوچھنے لگے "یہ کیا کتاب ہے،" میں نے کہا دہلی کے ایک شاعر میر حسن نے ایک مثنوی اردو میں لکھی تھی، اس کا انگریزی ترجمہ ہے، پوچھا، مضمون کیا ہے، میں نے کہا یونہی واہی تباہی بکا ہے، ایک کل کا گھوڑا بنا لیا ہے، اس پر سوار ہو کر شاہزادہ آسمان پر ہوا خوری کو جایا کرتا تھا، غرض اسی طرح کی بے تکی باتیں ہیں مجھ سے اتنا سنتے ہی مور کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی، آنکھیں چمکنے لگیں اور کہنے لگے " ذرا مجھ کو کل کے گھوڑے والا حصہ تو سناؤ،" میں نے کتاب میں سے وہ داستان نکالی اور پڑھنا شروع کیا، لیکن پڑھنے میں خلاف فطرت باتوں کے متعلق شاعر کا مذاق بھی اڑاتا گیا۔ میں پڑھ ہی رہا تھا کہ مور نے نہایت غصیلی آواز سے کہا۔

"او بے ادب خاموش" تجھ جیسا جاہل اس عالی قدر شاعر کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعر ہی نہ تھا بلکہ بجلی کی قوت اور کل پرزوں کی ترکیب کا بھی پورا ماہر تھا، تم جلیبوں کے لئے اس کی باتیں مضحکہ خیز ہوں تو ہوں لیکن سمجھنے والے کے لئے اس کا نکتہ چراغ ہدایت ہے" یہ سن کر میں دم بخود ہو گیا، کیونکہ ڈرتا تھا یہ حضرت کہیں بجلی کے ایک جھٹکے میں میرے جسم کے ذرات بنا کر ہوا میں نہ اڑا دیں۔ اس لئے ٹالنے کے لئے مسکرا کر کہا کہ اگر تم کو یہ کتاب پسند ہے تو لے لو کہ میرے دوست

کے کام آجائے، مور نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی، میرا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "یار عزیز اس کتاب نے اس وقت دماغ میں ایک خیال پیدا کردیا ہے۔ اس کو میں عملی صورت دینا چاہتا ہوں بس اب آپ اپنے گھر سدھاریں، تو بہتر ہے، اچھا خدا حافظ، اس کی یہ اکھڑی اکھڑی باتیں سنکر بڑی کوفت ہوئی، اور میں دل میں اسکو صلواتیں سناتا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔

چند روز تک میرا مور کے پاس جانا نہ ہوسکا، ایک دن جو ادھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مور کے دار التجربہ میں ایک نہایت خوبصورت مشکی گھوڑا ہنہنا رہا ہے، مجھے مور کے پاس گھوڑا دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ کیونکہ بھلا ایسے شخص کو ایسی چیزوں سے کیا واسطہ میں خود گھوڑوں کا بہت شوقین ہوں، کوئی گھوڑ دوڑ نہیں ہوئی جس میں اپنا کام ہرج کرکے نہ جاؤں، اس گھوڑے کو جو دیکھا تو بظاہر جاندار پایا، پاس جاکر ٹھپکا سم دیکھے، بھونریاں دیکھیں، جوڑ دیکھے، غرض ہر طرح بے عیب پایا۔ اتنے میں مور بھی اپنے کسی تجربہ سے فارغ ہوکر میرے پاس آکھڑے ہوئے، میں نے پوچھا "یار من گھوڑا کہاں سے مار لائے، اور کہاں لاکر رکھا ہے۔ کہ دار التجربہ میں خون کا امتحان کررہے ہو یا بجلی سے علاج" مور نے بڑے زور سے قہقہہ مارا، اور کہا" یار جانی، یہ وہی میر حسن کی مثنوی والا گھوڑا ہے، فرق صرف اتنا ہے، اڑ نہیں سکتا، میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ شاعر غضب کا دماغ لے کر آیا تھا۔ پرزے تو میں نے بھی نکال لیے، مگر ان کو بٹھا نہیں سکتا، خیر آئندہ دیکھا جائے گا، مجھے مور کی یہ گفتگو بہت بری معلوم ہوئی گویا ہم کو اندھا بنا رہا ہے، میں اس کو برا بھلا کہتا رہا۔ مگر وہ برابر ہنستا رہا، آخر کہنے لگا کہ کیا واقعی تم اس کو اصلی گھوڑا سمجھتے ہو!" میں نے کہا اور نہیں تو کیا مٹی کا ہے۔

مور۔ مٹی کا نہیں تو کل کا ضرور ہے۔

میں۔ تو کیا میں اندھا ہوں۔

مور۔ تو اس کا اندازہ تم خود کرلو،

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کے ایک پہلو کو دبایا اور پہلو کا پہلو اٹھا کر دوسری طرف الٹ دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گھوڑے کے پیٹ میں ہزاروں تار ادھر سے ادھر دوڑے ہوئے ہیں، سیکڑوں پرزے اس سرے سے اس سرے تک بیٹھے ہوئے ہیں، اور بیسیوں مقناطیس اور بیٹریاں جا بجا جمی ہوئی ہیں، یہ دیکھ کر میرے ہوش گم ہوگئے جب ذرا سنبھلا تو پوچھا کہ مور کیا واقعی یہ گھوڑا دوڑ سکتا ہے۔

مور۔ تو کیا میں نے یہ بچّوں کا کھلونا بنایا ہے، یہاں دوڑے گا اور خوب دوڑے گا

میں۔ اور اس کی انتہائی رفتار

مور۔ اس کا تو میں کوئی صحیح اندازہ نہیں کرسکتا۔ لیکن میرے خیال میں کم از کم (۳۰۰) میل فی گھنٹہ ہوگی۔

میں (۳۰۰) میل!

مور ہاں (۳۰۰) میل بلکہ کچھ زیادہ،

یہ سنتے ہی مجھے ٹکے پیدا کرنے کا خیال آگیا، اور سوچا کہ اس گھوڑے سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ میں نے مور پر ڈورے ڈالنے شروع کئے، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اگر یہ دو تین دوڑیں بھی جیت گیا تو بس میرے ولدر پار ہو گئے،

میں۔ کیوں یار اسے ڈربی کی گھوڑ دوڑ میں کیوں نہیں دوڑاتے۔

مور۔ ڈربی کیا بلا ہے۔

میں نے اسے سمجھانا چاہا مگر گھوڑ دوڑ کا مطلب نہ اسکی سمجھ میں آنا تھا نہ آیا۔ آخر تھک کر میں نے اس سے کہا " اچھا یہ تو بتاؤ اس کی رفتار کم زیادہ ہو سکتی ہے،

مور۔ یہ بھی ایک ہی کہی، اگر رفتار کم زیادہ نہ ہو سکے تو پھر ایجاد ہی کیا خاک ہوئی

میں۔ خیر یہ تو بتاؤ کہ اس گھوڑے کا تم کرو گے کیا، کیا اچار ڈالو گے۔

مور۔ کچھ نہیں کوئی صاحب آکر اٹھالے جائیں گے، پھر نہ گھوڑے کو مجھ سے کچھ کام اور نہ مجھ کو گھوڑے سے کچھ غرض،

میں۔ تو پھر یہ مجھے ہی دے ڈالو۔

مور۔ تم ہی لے جاؤ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ حق بھی تمہارا ہی ہے، تمہاری ہی کتاب سے یہ پیدا ہوا ہے، اور تم ہی اس کے زیادہ مستحق ہو، اندھا کیا چاہتا ہے دو آنکھیں میں نے مور سے اسکے چلانے کی پوری ترکیب سیکھ لی، گھوڑے کو کمرہ سے نکالا سوار ہو کر گھر آیا، اور تھان پر باندھ دیا، اس کے ایک دو روز بعد میں مور کے پاس گیا اس گھوڑے کا کچھ ذکر بھی چھیڑا۔ لیکن میرے یار کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس نے ایسا کوئی گھوڑا بنایا بھی تھا یا نہیں، چلو گئی گزری بات ہوئی۔

میرا ارادہ ہوا کہ ڈربی سے پہلے اس گھوڑا کو دو تین چھوٹی موٹی دوڑوں میں بھگالوں تاکہ لوگ اس کی حالت سے آگاہ ہو جائیں اور ایک دفعہ ہی ایسی بڑی دوڑ میں شریک ہونے کے متعلق کوئی ضابطہ کا اعتراض نہ ہو سکے، رجسٹر میں گھوڑا کا اندراج کرنے کے لئے گھوڑ دوڑ کے مہتمم نے اس کا نام دریافت کیا۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر تھی، اور میں اس کے لئے تیار نہ تھا، لیکن میری تیزی طبع نے اس مشکل کو باآسانی رفع کر دیا، پہلے میں نے اس کا نام "آدم" بتایا، مہتمم نے ماں اور باپ کا نام پوچھا میں نے کہا کہ آدم کی پیدائش کے لئے ماں باپ کی ضرورت نہیں ہے، مگر جب انہوں نے ضابطہ کی دفعہ بتائی تو مجھے لاچار نام تبدیل کرنا پڑا، آخر سوچتے سوچتے "ایجاد" نام سمجھ میں آیا "ضرورت" کو ایجاد کی ماں بتایا۔ اور "تجربہ" کو اسکا باپ، دادا پردادا کا نام دریافت کیا گیا تو نادر شاہ کے نسب نامہ پر عمل کر کے شمشیر ابن شمشیر کی بجائے ترقی ابن ترقی کا سلسلہ ستر پشت تک گنوا دیا۔ یہ بیان کافی سمجھا گیا اور "ایجاد" کے نام سے میرے گھوڑے کی رجسٹری ہو گئی

اب دوسری مشکل چابک سوار کی تھی، سوار ایسا ہونا چاہیئے تھا، جس کا نام فہرست چابک سواران میں درج ہو، اور جو لفظ ضمیر اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر ہو، اور ساتھ ہی قابل اعتبار بھی ہو، ظاہر ہے کہ ان صفات کا انسان ملنا آسان نہیں ہے مگر مثل مشہور ہے جو یندہ یابندہ، ایک اللہ کے بندے کو ڈھونڈھ ڈھانڈ کر نکال ہی لیا۔ اس کا نام فہرست میں تو ضرور تھا۔ لیکن مرد میدان نہ تھے دو چار مرتبہ گھوڑ دوڑ میں شریک بھی ہوئے مگر اپنی نا اہلی سے جیتے ہوئے گھوڑوں کو ہرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روٹیوں کو محتاج ہو گئے۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس کے کھانے کو رزق اور مرنے کو موت نہ ہو، وہ بیچارہ ضمیر اور اس کے پیچیدہ مسائل کی بحث میں کیوں جانے لگا، قصہ مختصر انہوں نے بلا پس و پیش نہایت خوشی سے میری ملازمت قبول کر لی، مجھے ان کی تمام صفتوں میں ان کی خاموشی سب سے زیادہ پسند آئی۔ ان کی خاموشی کا آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تصاویر ان کی خاموشی پر رشک کرتی تھیں، اور بت اس دیو جانس کلبی کے سامنے افلاطون اور سسرو معلوم ہوتے تھے۔

ان کا نام تو کلیٹس، جولیس، آگسس جو فرڈی گیر بلیو تھا، لیکن اپنی خاموشی نبھانے کے لیئے یہ صرف اپنا نام "کل" بتایا کرتے تھے، چلو چھٹی ہوئی، گھوڑا بھی کل کلا، اور چلانے والا بھی مجسم "کل"

میاں بات یہ ہے کہ یہ سب بن پڑے کا سودا ہے، جب تقدیر سیدھی ہو جاتی ہے تو سب مشکلیں اپنے آپ کھلتی چلی جاتی ہیں، چند ہی روز میں گھوڑا بھی مل گیا، اب رہ گئی دوڑ وہ تو پہلے سے جیتی جتائی رکھی تھی،

غرض اسی طرح دن پر دن گزرتے گئے اور آخر کار گھوڑ دوڑ کا دن آ گیا لیکن اس گھوڑے نے ایسی گمنامی میں پرورش پائی تھی کہ کسی کو کانوں کان یہ بھی خبر نہ تھی کہ "ایجاد"

کیا بلا ہے، کس دم کس کا ہے اور اس کے جیتنے کی توقع بھی ہے یا نہیں، عین گھوڑ دوڑ کے دن صبح کو مور کی پہلی بیوقوفی کا اظہار ہوا۔ شاید اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ زین گھوڑے کی کمر پر کسا جاتا ہے، اگر معلوم ہوتا رفتار بدلنے کی ہٹن پیٹھ پر قائم نہ کرتا۔ پہلی رفتار کا تعلق لگام سے رکھا تھا، لیکن بقیہ جس قدر تیز رفتاریاں تھیں ان کے ہٹن آگے پیچھے گھوڑے کی پیٹھ پر لگا دیئے تھے۔ آخر مسٹر کل نے اس معمہ کو حل کیا اور زین بجائے پیٹھ کے "ایجاد" کے پٹھوں پر کس دیا گیا، چونکہ رکابوں کے لئے جگہ نہ تھی اس لئے ان کو سرے سے اڑا ہی دیا، اور مسٹر کل زین پر اکڑوں بیٹھ کر مقابلہ کے لئے میدان میں اس طرح داخل ہوئے کہ ان کی سوکھی سوکھی ٹانگوں کے گھٹنے ان کے کانوں سے اوپر نکل گئے تھے، کمر دہری ہو کر کمان بن گئی تھی، اور وہ گھوڑے سے ہر جھٹکے پر زین سے پھدکتے اور پھر وہیں آ بیٹھتے تھے،

رغبت اور نفرت دیوانگی کی ابتدائی حالتوں کا نام ہے، طبیعت ایک چیز کو بلا وجہ پسند کرتی ہے، اور دوسری کو بلا سبب ناپسند، یہی حالت گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کی ہے بعض گھوڑوں کو محض اس وجہ سے پسند کیا جاتا ہے کہ ان کے باپ دادؤں نے یہ کارگزاریاں دکھائی تھیں، اور بعض کو اس لئے نظر سے گرا دیا جاتا ہے کہ ان کا سلسلہ نسب حضرت آدم کے گھوڑے تک نہیں پہنچتا۔ میرے بچارے گھوڑے کو اس طوفان بے تمیزی میں کون پوچھتا، اس کی حالت بس اس نواب بوچڑ یا راجہ پنساری کی سی تھی جو نشستی نوابوں اور راجاؤں کے کسی جلسہ میں آگیا ہو، کسی نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ یہ گھوڑا ہے یا گھوڑی، گدھا ہے یا خچر جب یہ صورت ہو تو بھلا اس چیز کا کون اندازہ کرنے لگا۔ کہ واقعی یہ گھوڑا ہے بھی یا نہیں البتہ مسٹر کل کے طریقہ نشست کا بڑا خاکہ اڑایا گیا مگر اس اللہ کے بندے نے یہ بھی سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ یہ فقرے اس پر کسے جا رہے ہیں یا کسی اور پر۔ شرطوں کی یہ حالت تھی کہ بعض گھوڑوں پر ایک کے دو بھی مشکل سے

ملتے تھے۔ مگر "ایجاد" پر ایک ایک کے ستو ستو دینے پر لوگ تیار تھے، میں نے بھی اپنی جمع پونجی سب اس شرط پر لگا دی، اور نہایت اطمینان کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر نتیجہ کا منتظر رہا۔ گھنٹی بجی، جھنڈی گری، اور گھوڑے تیر کی طرح نکلے۔ مسٹر کل نے یہ ہوشیاری کی کہ ایجاد کو شتر بے مہار نہیں کیا بلکہ اس کو نہایت احتیاط سے چلاتا ہوا لایا، اور صرف ناک کی پھننگ سے یہ دوڑ جیتی، ہزاروں کے دیوالے نکل گئے اور میں نے صرف ایک دوڑ میں دس لاکھ روپیہ سمیٹ لئے اس میں سے ایک لاکھ تو مسٹر کل کے حصہ میں آیا۔ اور بقیہ نے میری حالت قابلِ رشک بنا دی تمام دنیا میں اس دوڑ کا چرچا ہو گیا، تین اخباروں کے مضامین کے کچھ حصے نقل کرتا ہوں، اس سے لوگوں کے خیالات کا اندازہ لگ سکے گا۔

## "اخبار گھوڑ دوڑ"

لکھتا ہے "ہم کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جو گھوڑا گزشتہ دوڑ میں جیتا ہے وہ سلطان روم کی خاص سواری کا تھا۔ اور محض اس کی قوت اور کس کا اندازہ کرنے کے لئے تبدیل نام کے ساتھ اس کو اس دوڑ میں شریک کیا گیا تھا ہم نے اپنے قارئین کی اطلاع کے لئے ہزاروں روپیہ خرچ کر کے یہ بھی دریافت کر لیا ہے کہ اس گھوڑے کی نسل کو پوشیدہ رکھنے میں انتہائی کوشش کی جاتی ہے، اور بچہ پیدا ہونے کے بعد ہی ماں اور باپ دونوں کو مار دیا جاتا ہے۔ تاکہ نسل زیادہ نہ بڑھے، یہ اب تک پتہ نہ چلا کہ ان گھوڑوں کا جنگل صحرائے عرب کے کس حصہ میں واقع ہے، البتہ یہ ضرور معلوم ہو چکا ہے کہ جتنے سائیس اور سوار اس جنگل میں ہیں ان کی آنکھیں پھوڑ دی گئی ہیں، اور زبانیں کاٹ لی گئی ہیں، تاکہ کسی کو اس جنگل کی جائے وقوع معلوم نہ ہو سکے آئندہ جو مزید حالات ظاہر ہوں گے وہ ناظرین کی معلومات میں اضافہ کرنے کیلئے پیش کئے جائیں گے۔

# اقتباس از اخبار پنچ

محققین زبان کو یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوگی کہ "دم پر نمدہ باندھے، اور دم دبا کر بھاگنے" کے محاوروں کی اصلیت کو گذشتہ گھوڑ دوڑ میں ایک نئے گھوڑے "ایجاد" نامی نے ظاہر کر دیا۔

ان دونوں محاوروں کا مفہوم ہمیشہ "بے تحاشا بھاگنا" لیا جاتا تھا۔ لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دم پر نمدہ باندھنے یا دم دبانے سے رفتار میں تیزی کس طرح پیدا ہوسکتی ہے، اس گھوڑ دوڑ میں "ایجاد" کے زین کا نمدہ یعنی عرق گیر بجائے کمر پر رکھنے کے اس کے پٹھوں پر جوڑ رکھا گیا، اور واقعی اس طرح اس کی دم پر نمدہ بھی آگیا، اور دم دب بھی گئی۔ اس گھوڑے کا ایسی بڑی دوڑ جیتنا اس کی تیز رفتاری کا بیّن ثبوت ہے، ہم اس گھوڑے کے مالک کو ان کی کامیابی پر مبارکباد بھی دیتے ہیں اور لغات کے اہل فن کی جانب سے شکریہ بھی ادا کرتے ہیں کہ ان کے گھوڑوں کی بدولت بآسانی دو پیچیدہ محاوروں کی تشریح ہوگئی۔

# مقالہ افتتاحیہ اخبار سائنس

"رواج اور قدامت پسندی ہمیشہ سے مانع ترقی رہے ہیں، لیکن بلحاظ اپنی قدامت کے کوئی ایسا رواج ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ جو گھوڑوں پر زین کسنے کے پرانے طریقہ کا مقابلہ کر سکے۔ تاریخ پر جہاں تک نظر ڈالی جاتی ہے، اور پرانے کتبوں، تصویروں اور مجسّموں کو جہاں تک دیکھا جاتا ہے یہی پتہ چلتا ہے کہ زین یا چار جامہ ہمیشہ گھوڑوں کی پیٹھ ہی پر ڈالا گیا ہے۔ لیکن اصول سائنس سے اگر اس طریقہ عمل کو دیکھا تو یقیناً پہلی ہی نظر میں یہ بالکل خلاف فطرت معلوم ہوگا گھوڑے کی بناوٹ ظاہر کر رہی ہے، کہ اس کے پچھلے پٹھے پر بوجھ سہارنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ نہ کہ اگلی ٹانگیں اگر فطرت کا یہ تقاضا ہوتا کہ پیٹھ پر بوجھ قائم کیا جائے تو گھوڑے کے اگلے اور

پچھلے پیر دونوں کی وضع ایک ہی ہوتی تاکہ بوجھ ان چاروں حصّوں پر برابر تقسیم ہو جائے۔ لیکن گھوڑے کی ساخت زبان حال سے بتا رہی ہے کہ اس کے پچھلے پیروں پر بوجھ ڈالو، اور اگلے پاؤں رفتار کے لئے چھوڑ دو۔

خود چوپاؤں کے بھاگنے کے طریقہ پر اگر سائنس کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے، تو یہ مسئلہ اور بھی آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔ جانور کی چاروں ٹانگیں اگر آگے کو جھکیں گی تو ہمیشہ رفتار میں تیزی پیدا ہوگی۔ اس اصول کو اب واقعات سے منطبق کیجئے۔ جانور کی پیٹھ پر بوجھ رکھنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ اس کی پچھلی ٹانگیں تو ضرور آگے کو جھک آتی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے اگلے پیر بجائے آگے جھکنے کے پیچھے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور اس سے یقیناً رفتار پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ عرصہ سے ہمارے زیر غور تھا، لیکن ہم اس پر کچھ لکھنے کی ہرگز جرأت نہ کرتے اگر گذشتہ گھوڑ دوڑ میں "ایجاد" نے اس اصول کو عملاً ثابت نہ کر دیا ہوتا۔ کیونکہ ایسے قدیم رواج کے خلاف ایک حرف بھی لکھنا مفت لڑائی مول لینا ہے، ہم کو امید ہے کہ اب قدامت پسند لوگوں کی آنکھیں سائنس کا عملی تجربہ دیکھنے کے بعد کھلیں گی اور آئندہ گھوڑ دوڑ میں ہم رواج کے مقابلہ میں سائنس کی فتح کو اس شکل میں دیکھیں گے کہ بجائے پیٹھ کے سب گھوڑوں کے پٹھوں پر زین کسے ہوں گے۔

غرض خدا خدا کر کے ایک گھوڑ دوڑ میں میری مالی حالت درست ہو گئی لیکن اب یہ مصیبت آپڑی کہ جو سہولتیں "ایجاد" کی گمنامی کی وجہ سے تھیں وہ جاتی رہیں اور اب لوگوں پر یہ ظاہر کرنا پڑا کہ یہ کھاتا، پیتا، ہگتا، موتتا ہوا گھوڑا ہے، یہ کام بظاہر مشکل تھا۔ مگر میری جدّت طبع نے اسکو بھی آسان کر دیا۔ ایک اسی کے قدو قامت رنگ ڈھنگ وضع قطع کا گھوڑا راتوں رات خرید لایا، اصلی گھوڑے کو

تھان پر باندھ دیا اور نقلی کو ایک کمرہ میں بند کر دیا، بڑے بڑے ماہران فن آتے اور گھوڑے کو دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ اس میں تو کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آتی جو اتنی بڑی گھور دوڑ اس کو جتوا سکے، نہ تو جوڑ ہی مضبوط ہیں اور نہ بناوٹ ایسی سبک ہے پھر اس قیامت کی رفتار اس میں پیدا ہو گئی تو کہاں سے پیدا ہو گئی، غرض جتنے منھ اتنی باتیں، ہر شخص اپنی اپنی ہانکتا تھا۔ مگر اس عقدہ کو کوئی نہ کھول سکتا تھا۔ آخر ہوتے ہوتے دوسری گھوڑ دوڑ کا دن آگیا۔ رات ہی کو نقلی اصطبل میں اور اصلی کمرہ میں منتقل کر دیا گیا۔ اور میں اور مسٹر کل گھوڑے کو لے کر عین وقت پر میدان میں پہنچے، کیا دیکھتا ہوں کہ جتنے گھوڑے دوڑنے والے ہیں سب ایک قطار باندھے کھڑے ہیں اور بڑے بڑے حساب دان تقسیم وزن کا لحاظ کر کے ناپ ناپ کر ان کے پٹھوں پر زین بندھوا رہے ہیں۔ غرض یہ مشکل بھی آسان ہو گئی، اور گھنٹہ بجتے ہی سب گھوڑ دوڑ کے لئے ایک صف میں کھڑے ہو گئے، ادھر جھنڈی گری اور ادھر سواروں کے گھوڑوں کے چابک رسید کئے، چابک مارنا تھا کہ قیامت بپا ہو گئی، مارے دولتیوں اور پشتکوں کے گھوڑوں نے سواروں کی جانیں ہلا دیں۔ بعض تو ڈر کر کود گئے۔ بعض ہمت والے تھے وہ جھٹکے جھیلتے رہے لیکن تھوڑی ہی دیر میں تماشائیوں کے سروں اور کندھوں پر گھٹریوں کی شکل میں نظر آئے۔ ایک ایجاد تھا کہ وہ اول آخر سب کچھ رہا۔ چونکہ اس دوڑ میں لوگوں نے ذرا سمجھ بوجھ کر لگایا تھا اس لئے میری آمدنی بھی کچھ زیادہ نہ ہوئی پھر بھی ستر اسی ہزار میں نے بنا ہی لئے۔

اس واقعہ کے متعلق اخباروں میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں سے بعض کا اقتباس ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

## "اخبار گھوڑ دوڑ"

ہم کو سرکاری طور پر اطلاع ملی ہے کہ علاقہ نجد کے کسی نامعلوم مقام پر دو ہوائی جہازوں پر گولیاں برسائی گئیں جس کی وجہ سے وہ نیچے اترنے پر مجبور ہوئے دونوں جہازوں پر جتنے لوگ سوار تھے ان سب کو نہایت بیدردی سے ذبح کر دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی مقام کے آس پاس کہیں سلطان روم کے خاصہ کے گھوڑوں کا جنگل ہے ورنہ بلا وجہ جہازوں پر گولیاں چلانے اور ان کی سواریوں کو ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی امید ہے کہ گورنمنٹ اس اہم معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر صدیوں کے راز کا انکشاف کرے گی۔"

پنچ میں ایک نہایت مختصر سا مضمون تھا کہ "اس مرتبہ گھوڑوں کی دموں پر نمدہ باندھا گیا تھا۔ مگر بد قسمتی سے دوڑ کے وقت بہت سے سواروں کے چوتڑوں پر نمدہ بندھ گیا اور اکثر سواروں میں اتنی تیزی آگئی کہ وہ اپنے زور میں اچھل اچھل کر گھوڑوں کی گردنوں سے آگے نکل گئے۔

## "اخبار سائنس"

کا مضمون بہت عالمانہ تھا اس نے روح پر بحث کر کے لکھا تھا کہ ماہران فن علم حیوانات اس وقت تک قائل نہ تھے کہ انسان اور حیوان دونوں میں ایک ہی قسم کی روح ہوتی ہے اور اسی لئے حیوانوں میں بھی رواج اور قدامت پسندی اسی طرح جاری اور ساری ہے جس طرح انسانوں میں ہے اس مسئلہ کا تصفیہ گذشتہ گھوڑ دوڑ نے نہایت اطمینان بخش طریقہ پر کر دیا اور اب کسی کو اس کے خلاف زبان ہلانے کی گنجائش نہیں رہی۔ رواج قدیم کے خلاف مگر اصول سائنس کے موافق اس گھوڑ دوڑ میں زین بجائے پیٹھ پر رکھنے کے گھوڑوں کے پٹھوں پر کسا گیا تھا گو اس طریقہ عمل سے ان جانوروں کو زیادہ آسائش و سہولت تھی۔ لیکن رواج قدیم کے خلاف ہونے کی وجہ سے انھوں نے بطور احتجاج دولتیاں جھاڑنا اور ٹھینگیں مارنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان گھوڑوں کی

بیوقوفی کے باعث پھر "ایجاد" نامی گھوڑا جو اصول سائنس کو سمجھتا اور اپنی آسایش کا احساس رکھتا تھا، بازی لے گیا۔ لیکن وہ زمانہ کچھ دور نہیں ہے جب یہ جانور بھی اپنی ضد سے باز آجائیں گے اور قدامت پسندی کو اس طرح ترک کر دیں گے جس طرح گذشتہ گھوڑ دوڑ کے بعد سے انسانوں نے ترک کر دیا ہے۔

اب ڈربی کا زمانہ قریب آگیا اور "ایجاد" کے ٹکٹوں کی قیمت چڑھنا شروع ہوئی تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ روپے پر ایک آنہ بھی کوئی دینے پر تیار نہ تھا لیکن اسکے ساتھ ہی میں ایک دوسرے خلجان میں پڑ گیا۔ جو لوگ گھوڑ دوڑ کے فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک گھوڑے کے نکل جانے سے شرطوں میں زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے اس لئے بعض بے ایمان لوگ ایسے نکل آتے ہیں جو گھوڑوں کو زہر دینے یا اصطبل کو بم سے اڑا دینے میں بھی تامل نہیں کرتے باوجود میری حفاظتی تدابیر کے ایک روز رات کے بارہ بجے میرا اصطبل مع اصلی گھوڑے کے بم سے اڑا دیا گیا۔ اور بیچارے ناکردہ گناہ کے چھیچھڑے اور کھال کے ٹکڑے کئی کئی میل کے فاصلہ پر پائے گئے۔ لیکن شکر ہے کہ میرا "ایجاد" اس حملہ سے محفوظ رہا، اور دوسرے ہی دن صبح کو اس واقعہ کا حال اخباروں میں بڑے بڑے موٹے حرفوں میں چھپ گیا۔ اور چھپنے کے ساتھ ہی "ایجاد" کے ٹکٹوں کی قیمت گر گئی میرے لئے یہ "عدو شرے برانگیزد کہ خیرے ما درآں باشد" کا مصداق ہو گیا اور میں نے ایک کا جواب نہ دیا، لوگوں کا تعجب ہوتا تھا کہ میں مرے ہوئے گھوڑے کے ٹکٹ کیوں خرید رہا ہوں۔ لوگوں میں بہت کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں اور آخر انھوں نے پتہ چلا لیا کہ "ایجاد" میرے سونے کے کمرے میں صحیح سلامت موجود ہے۔

ڈربی سے ایک دن پہلے میں اور مسٹر کل اپنے کمرہ میں کھڑے گھوڑے کی دیکھ بھال کر رہے تھے کہ سامنے کی کھڑکی میں سے پستول چلا اور گولی "ایجاد" کے پہلو میں لگ کر آر سے پار ہو گئی۔ میں کھڑکی سے کود کر اس شخص کے پیچھے بھاگا لیکن وہ ہاتھ نہ آیا پولیس میں

اطلاع دینا گویا اپنا راز کھول کر خود کو تباہ کر لینا تھا۔ اس لئے خاموشی اختیار کی واپس آکر میں نے اور مسٹر کل نے "ایجاد" کے پرزوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا لیکن کوئی خرابی نظر نہ آئی اور ہم نے "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت" کا ورد کر کے ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی "ایجاد" کے مالک کی حیثیت سے تو تمام دنیا میں مشہور ہو گیا تھا۔ لیکن دل چاہتا تھا کہ "ایجاد" پر سوار ہو کر اور خود ڈربی جیت کر اپنی شہرت کو چار چاند لگاؤں۔ اس لئے میں نے تہیہ کر لیا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس مرتبہ تو میں ہی اس پر سوار ہوں گا۔ مسٹر کل نے منع بھی کیا لیکن میں نے ایک نہ مانی اور صبح ہی سے تیاری کر دی

ڈربی کے میدان میں پہنچا تو دل ہیبت سے کانپ گیا، جہاں تک نظر جاتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ خود بادشاہ سلامت بھی مع خاندان شاہی کے رونق افروز تھے تمام گھوڑے یکے بعد دیگرے ان کے سامنے سے گذارے گئے جب "ایجاد" میدان میں آیا تو تالیوں کی آواز سے آسمان گونج گیا۔ میں نے بھی خراماں خراماں گھوڑے کو میدان کا چکر دیا۔ اور سب گھوڑوں میں ملا کر کھڑا کر دیا۔ گھنٹہ بجا۔ جھنڈی گری اور سب گھوڑے آندھی کی طرح رواں ہوئے۔ مگر "ایجاد" نے بے تحاشا بدکنا شروع کیا۔ ایک تو غصہ دوسرے شرمندگی، میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پورے زور سے تیز رفتاری کا بٹن دبا دیا جس وقت بٹن دبایا تو اس کے منہ کی بجائے اس کی پیٹھ میدان کی طرف تھی، میری حیرت کی کچھ انتہا نہ رہی، جب میں نے دیکھا کہ "ایجاد" نے پوری رفتار کے ساتھ الٹے پاؤں بھاگنا شروع کیا، معلوم ہوتا ہے کہ رات والی گولی نے لگام والی رفتار کے پرزے کو تو کوئی ضرر نہیں پہنچایا تھا۔ مگر تیز رفتاری کے پرزوں کے عمل کو بالکل بدل دیا تھا۔ میں نے گھوڑے کو روکنا چاہا، تو پسینے چھوٹ گئے کیونکہ میرے زور سے دبانے کی وجہ سے بٹن دب کر ٹوٹ گیا تھا۔ اب کیا تھا۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا اور تھوڑی دیر میں دوسرے گھوڑوں کو جا لیا اور آن واحد میں ان سے آگے

نکل گیا۔ گو یہ گھوڑے آگے بڑھ رہے تھے مگر میرے الٹی رفتار کے باعث پیچھے ہٹتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، اور گو میں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ لیکن دراصل ان سے آگے بڑھا جاتا تھا لوگوں کے قہقہوں اور تالیوں نے صور اسرافیل کی صورت پیدا کرلی اور بعض سواروں کو ہنسی کی وجہ سے اپنے گھوڑوں کو روکنا پڑا۔ واقعہ کے بیان کرنے میں عرصہ لگا ہے لیکن خود یہ واقعہ شروع ہوا اور آناً فاناً میں ختم ہوگیا اور ڈربی کی تاریخ میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ جیتنے میں کسی گھوڑے کا حساب سر کی لمبائی سے لگانے کی بجائے دم کی لمبان سے لگانا پڑا۔

اب مشکل یہ آپڑی کہ گھوڑا نہ اب رکتا ہے نہ جب میدان کو عبور کرکے باڑ توڑتا ہوا تماشائیوں میں گھس گیا۔ جدھر نکل گیا کائی سی پھٹ گئی۔ بھیڑ چھٹ گئی اور میدان صاف ہوگیا۔ اب میں کروں تو کیا کروں۔ رفتار ایسی تیز تھی کہ کودنے کی ہمت نہ پڑتی تھی میں نے دیکھا کہ دو ایک خالی موٹر کھڑی ہے۔ جب گھوڑا اس کے پاس سے نکلا میں اللہ کا نام لے دھم سے موٹر میں کود پڑا۔ اب رہے میاں "ایجاد" تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کا کیا حشر ہوا۔ البتہ دوسرے روز کے اخبار میں ہوائی خبر سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ ایک گھوڑا الٹا تیرتا ہوا افریقہ کے جنوبی کنارے پر دیکھا گیا۔ اخبار گھوڑدوڑ کا خیال ہے کہ فطرت اس کو اپنے مسکن کی طرف لے جارہی ہے لیکن پنچ کی رائے ہے کہ جب تک اس کی دم پر نمدہ بندھا رہے گا اس کی رفتار کم نہ ہوگی، اب آپ ہی بتائیے کہ دونوں میں کون سچا ہے میرے چوٹ تو آئی مگر سمجھا چلو جان بچی لاکھوں پائے۔ لنگڑے ہوگئے تو کیا ہرج ہے، ڈربی تو جیت لی۔ بدھیا مری تو مری آگرہ تو دیکھ لیا۔

## ہم اور ہمارا امتحان

جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم ذوق مرحوم فرما گئے ہیں ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

بعض انسان دنیا کے تاریک پہلو کو دیکھتے ہیں اور بعض روشن پہلو کو۔ ایک ہی چیز ایک کو بُری معلوم ہوتی ہے اور دوسرے کو اچھی۔ امتحان ایک کے لئے آفت جان ہوتا ہے اور دوسرے کے لئے دلفریب۔ انہی دو رخوں کو دو صاحبوں نے اپنی اپنی سرگزشت میں دکھایا ہے۔ اس کے روشن رخ کا کچھ حصہ رسالہ افادیہ میں چھپا تھا مگر وہ رسالہ کے حق میں غالب کا قصیدہ ہوگیا۔ اور اس کی اشاعت کے ساتھ ہی رسالہ افادیہ کا خاتمہ بالخیر ہوگیا۔

اب یہ دونوں رخ رسالہ نمائش کے لئے بھیجتا ہوں۔ دونوں کو ایک ہی پرچہ میں چھاپ دیجئے۔ تاکہ آپ کے رسالہ کا حشر بھی اس کی نحوست سے کہیں وہ نہ ہو جو رسالہ افادیہ کا ہوا۔ اگر چھاپنے کی ہمت نہ ہو مضمون واپس کردیجئے۔ جو ایڈیٹر صاحب اپنے رسالہ کی بنیاد کو بہت قوی سمجھتے ہیں ان کو بھیج دوں گا۔ دیکھوں وہ بھی اس ٹکر کی تاب لاتے ہیں یا نہیں والسلام (مرزا الم نشرح)

## تصویر کا ایک رخ

نہ ہوئی گر مرے پرچوں سے تسلی نہ سہی امتحان اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ سہی

لوگ امتحان کے نام سے گھبراتے ہیں لیکن مجھے ان کے گھبرانے پر ہنسی آتی ہے آخر امتحان ایسا کیا ہوتا ہے۔ دو ہی صورتیں "فیل یا پاس" اس سال کامیاب نہ ہوئے آئندہ سال سہی۔ میں اپنے دوستوں اور ہم جماعتوں کو دیکھتا تھا کہ جوں جوں امتحان کے دن قریب آتے جاتے ان کے حواس پراں۔ ان کا دماغ مختل اور ان کی صورت اتنی سی نکل آتی تھی۔ بندہ درگاہ پر امتحان کا نہ رتی برابر اثر پہلے تھا۔ اور نہ اب بھی اس کے ختم ہو جانے کا افسوس ہے، امیدواروں کا مجمع نئی نئی صورتیں عجیب عجیب خیالات۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے کبھی دل سیر نہیں ہوسکتا جی چاہتا ہے کہ تمام عمر امتحان ہوئے جاتے۔ لیکن پڑھنے اور یاد کرنے کی شرط اٹھا دیجئے میری مانئے۔

دو سال میں لا کلاس کا کورس پورا کیا مگر کس طرح شام کو یاروں کے ساتھ ٹہلنے نکلتا واپسی کے وقت لا کلاس میں بھی جھانک آتا۔ منشی صاحب دوست تھے اور لکچرار پڑھانے میں مستغرق حاضری کی تکمیل میں کچھ دشواری نہ تھی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ لا کلاس میں شریک ہونے سے میرے کس مشغلہ میں فرق آسکتا تھا؟ والد صاحب قبلہ خوش تھے۔ کہ بیٹے کو قانون کا شوق ہو چلا ہے کسی زمانہ میں بڑے بڑے وکیلوں کے کان کترے گا۔ ہم بھی بے فکر تھے کہ چلو دو برس تک تو کوئی محنت کیلئے کہہ ہی نہیں سکتا بعد میں دیکھئے کون جیتا ہے اور کون مرتا ہے، لیکن زمانہ آنکھ بند کئے گذر جاتا ہے، دو سال ایسے گذر گئے جیسے ہوا۔ لا کلاس کا صداقت نامہ بھی مل گیا۔ اب کیا تھا والدین امتحان وکالت کی تیاری کے لئے سر ہو گئے مگر میں بھی ایک ذات شریف ہوں ایک بڑھیا اور ایک بڈھے کو دھوکا دینا کیا بڑی بات ہے۔ میں نے تقاضا کیا کہ علیحدہ کمرہ مل جائے تو محنت کروں۔ بال بچوں کی گڑبڑ میں مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا چند روز اسی حیلے سے ٹال دیئے لیکن تابکے! بڑی بی نے اپنے سونے کا کمرہ خالی کر دیا۔ اب میں دوسری چال چلا، دروازوں میں شیشے تھے ان پر کاغذ چپکا دیا۔ لیمپ روشن کر کے آرام سے سات بجے سے سو جاتا اور صبح نو بجے اٹھتا۔ اگر کسی نے آواز دی اور آنکھ کھل گئی تو ڈانٹ دیا کہ خواہ مخواہ میری پڑھائی میں خلل ڈالا جاتا ہے، اگر آنکھ نہ کھلی اور صبح کو سونے کا الزام لگایا گیا! تو کہدیا کہ میں پڑھتے وقت کبھی جواب نہ دوں گا۔ آئندہ کوئی مجھے دق نہ کرے بعض وقت ایسا ہوا کہ لیمپ بھڑک کر چمنی سیاہ ہو گئی۔ اور میری زیادہ محویت و محنت کا نتیجہ سمجھی گئی بعض وقت والد والدہ کہتے بھی تھے کہ اتنی محنت نہ کیا کرو۔ لیکن میں زمانہ کی ترقی کا نقشہ کھینچکر ان کا دل خوش کر دیا کرتا خدا خدا کر کے یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔ اور امتحان کا زمانہ قریب آیا میں نے گھر میں بہت کہا کہ ابھی میں امتحان کے لئے جیسا چاہئے ویسا تیار نہیں ہوں

لیکن میری مسلسل حاضری لاکلاس اور شبانہ روز کی محنت نے ان کے دلوں پر سکہ بٹھا رکھا تھا، وہ کب ماننے والے تھے، پھر بھی احتیاطاً اپنے بچاؤ کے لئے ان سے کہہ دیا کہ اگر میں فیل ہو جاؤں تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی۔ کیونکہ میں اپنے آپ کو ابھی امتحان کے قابل نہیں پاتا۔ لیکن والد صاحب مسکرا کر بولے کہ امتحان سے کیوں ڈرے جاتے ہو، جب محنت کی ہے تو شریک بھی ہو جاؤ کامیابی و ناکامیابی خدا کے ہاتھ ہے

ع مرد باید کہ ہراساں نہ شود

میں نے بھی تقدیر اور تدبیر پر ایک چھوٹا سا لکچر دے کر ثابت کر دیا کہ تدبیر کوئی چیز نہیں تقدیر سے تمام دنیا کے کام چلتے ہیں۔

قصہ مختصر درخواست شرکت دی گئی اور منظور ہو گئی۔ اور ایک دن وہ آیا کہ ہم ہال کا ٹکٹ لئے ہوئے مقام امتحان پر پہنچ ہی گئے۔ گو یاد نہیں کیا تھا۔ لیکن دو وجہ سے کامیابی کی امید تھی "اول تو امداد غیبی" دوسرے پرچوں کو الٹ پھیر" شاید حضرات جو امتحان میں کبھی شریک نہیں ہوئے اس مضمون کو نہ سمجھیں اس لئے ذرا وضاحت سے عرض کرتا ہوں "امداد غیبی" سے مراد امیدواران امتحان کی اصطلاح میں وہ مدد ہے جو ایک کو دوسرے سے یا کسی نیک ذات نگران کار سے یا عند المواقع کتاب سے پہنچ جاتی ہے پرچوں کی الٹ پھیر گو بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہے لیکن تقدیر سب کچھ آسان کر دیتی ہے۔ بعض شریف کم حیثیت ملازم ایسے بھی نکل آتے ہیں جو بامید انعام پرچہ بدل دیتے ہیں یہ ضرور ہے کہ اس سے ایک محنت کرنے والے کو نقصان پہنچ جاتا ہے لیکن تدبیر و تقدیر کا مسئلہ جیسا اس کارروائی میں حل ہوتا ہے دوسری کسی صورت میں حل نہیں ہوتا اس کے علاوہ اور بھی صورتیں ہیں لیکن وہ بہت کم پیش آتی ہیں اس لئے ان پر بھروسہ کرنا نادانی ہے خیر آمدم برسر مطلب پونے دس بجے گھنٹی بجی اور ہم بسم اللہ کہہ کر کمرہ امتحان میں داخل ہوئے یہاں ایک بہت خلیق اور

ہنس مکھ نگراں کار تھے مجھے جگہ نہیں ملتی تھی میں نے ان سے کہا وہ میرے ساتھ ہو گئے جگہ بتائی اور بڑی دیر تک ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے میں سمجھا چلو بڑا پار ہے اللہ دے اور بندہ لے

ٹھیک دس بجے پرچہ تقسیم ہوا میں نے پرچہ لیا۔ سرسری نظر ڈالی اور میز پر رکھ دیا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ پرچہ پڑھنے کے بعد جیسا میرے چہرے پر اطمینان تھا شاید ہی کسی کے چہرے پر ہو گا۔ خود تو اس پرچہ کے متعلق اندازہ نہ کر سکا لیکن نگراں کار صاحب کو یہ کہتے ضرور سنا کہ پرچہ مشکل ہے۔ میں کئی مرتبہ اول سے آخر تک اس کو پڑھ گیا لیکن یہ نہ معلوم ہوا کس مضمون کا ہے جوابات کی کاپی دیکھی۔ اس کے آخر کی ہدایتیں پڑھیں صفحہ اول کی خانہ پوری کی اور کھڑا ہو گیا۔ گارڈ صاحب فوراً ہی آئے میں نے ان سے کہا کہ جناب یہ پرچہ کس مضمون کا ہے، وہ مسکرائے، زبان سے تو کچھ نہ بولے مگر پرچہ کے عنوان پر انگلی رکھ دی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ "اصول قانون" کا پرچہ ہے دل کھل گیا۔ اب کیا تھا، میں نے بھی قلم اٹھا کر لکھنا شروع کر دیا کیونکہ اصول کیلئے کسی کتاب کے پڑھنے کی ضرورت تو ہے ہی نہیں۔ اس مضمون پر ہر شخص کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ ایک مقنن ایک اصول قائم کرتا ہے دوسرا اس کو توڑ دیتا ہے کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی رائے کو کسی دوسرے کی تجویز کا پابند کریں، میں نے اپنے برابر والے سے پوچھنے کی کوشش بھی کی کچھ ادھر ادھر نگاہ بھی دوڑائی۔ مگر گارڈ صاحب میری حالت کو کچھ ایسا تاڑ گئے تھے کہ ہر وقت بلائے ناگہانی کی طرح سر پر ہی کھڑے رہتے تھے، ذرا میں نے ادھر ادھر گردن پھیری اور انھوں نے آواز دی کہ "جناب اپنے پرچہ پر نظر رکھئے۔"

جب دوسروں سے مدد ملنے کی توقع منقطع ہو گئی۔ تو میں نے دل میں سوچا کہ چلو ان گارڈ صاحب سے ہی پوچھیں۔ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ آئے میں نے دریافت کیا کہ جناب اس دوسرے سوال کا کیا جواب ہے وہ مسکرائے اور کہا کہ مجھے معلوم نہیں میں نے کہا

کہ یہ برابر والے بڑے زور سے لکھ رہے ہیں ان سے پوچھ لیجئے۔ اور اگر آپ کو دریافت کرتے ہوئے لحاظ آتا ہے تو ذرا ادھر ٹہلتے ہوئے تشریف لیجائیے میں خود پوچھ لونگا مگر وہ کب ہلنے والے تھے قطب ہو گئے ان کا مسکرانا پہلے تو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پھر آخر میں تو زہر ہو گیا، میں واللہ سچ کہتا ہوں کہ اگر تمام عمر میں قلبی نفرت مجھے کسی سے ہوئی ہے تو انہی صاحب سے ہوئی ہے، ان کا وہ مسکراتے ہوئے ٹہلنا۔ مجھے ایسا برا معلوم ہوتا تھا کہ کئی دفعہ میں نے ارادہ کر لیا کہ اگر میرے برابر کھڑے ہو کر یہ مسکرائے تو ضرور گلخنب ہو جاؤں۔ لیکن پھر سوچا کہ سرکاری معاملہ ہے کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جاؤں، اس لئے چپکا ہو رہا۔ غرض اس طرح یہ تمام دن امتحان کے گذر گئے۔ لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے ظالم کے ساتھ ایسی حالت میں کہ ایک حرف بھی یاد نہ ہو پورے چھ گھنٹے گزارنے کیسے مشکل ہوں گے، میں تو ہر روز آدھ گھنٹہ کے بعد ہی کمرے سے نکل آتا۔ لیکن مصیبت یہ آن پڑی کہ والد صاحب روز گیارہ بجے سے آجاتے اور نیچے صحن میں بیٹھے رہتے۔ اب میں جلدی باہر آجاتا تو جو رعب میں نے دو سال کے عرصہ میں قائم کیا تھا وہ سب ہوا ہو جاتا۔ اس لئے قہر درویش، برجان درویش، آخری وقت تک کمرہ امتحان میں بیٹھا رہتا اور جب نیچے اترتا تو والد صاحب سے پرچہ کی سختی کی ضرور شکایت کرتا۔ وہ بھی میری تشفی کے لئے ممتحن کو بہت کچھ برا بھلا کہتے۔ لیکن ان کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو میرا بیٹا کامیاب ضرور ہو گا۔ امتحان ختم ہوا۔ اور امید نمبر ایک اور دو کا خون ہو گیا۔ اب ممتحنوں کے پاس کوشش کی سوجھی، والد ایک زبردست چھٹی سفارش کی لے کر ایک صاحب کے یہاں پہنچے وہ چھٹی دیکھ کر بہت اخلاق سے ملے آنے کی وجہ دریافت کی۔ والد صاحب نے عرض کیا کہ خادم زادہ اس سال امتحان میں شریک ہوا ہے اگر آپ کوشش فرمائیں تو یہ خانہ زاد ہمیشہ ممنون احسان رہے گا، وہ بہت ہنسے اور دوسرے لوگوں سے جو سلام کو حاضر ہوئے تھے فرمانے لگے

یہ عجیب درخواست ہے ان کا بیٹا امتحان دے اور کوشش میں کروں بندہ خدا اپنے لڑکے سے کہو کہ وہ خود کوشش کرے۔ بیچارے بڑے میاں ایسے نادم ہوئے کہ پھر کسی کے پاس نہ گئے، کچھ عرصہ کے بعد نتیجہ بھی شائع ہوگیا اور کمترین جملہ مضامین میں بدرجہ اعلیٰ فیل ہوا۔ خبر نہیں کہ وہ کون سے بھلے مانس ممتحن تھے کہ انھوں نے دو نمبر بھی دیئے، باقی نے تو صفر ہی پر ڈالا۔ والد صاحب کو بہت رنج ہوا۔ نمبروں کی نقل حاصل کی، اور بالآخر یہی رائے قرار پائی کہ کسی بدمعاش چپراسی نے بدل دیئے ورنہ ممکن تھا کہ برابر تین گھنٹے لکھا جاتا اور صفر ملتا مجھے بھی تعجب تھا کیونکہ میں نے پرچے کچھ ایسے برے نہیں کئے تھے، فیصلہ کے دو پرچوں کے جوابات تو مجھے کچھ یاد ہیں وہ ناظرین کے سامنے پیش کرکے ان سے انصاف کا طالب ہوں۔ بقیہ پرچوں کے متعلق تو مجھے خود یاد نہیں رہا کہ سوال کیا تھا۔ اور میں نے جواب کیا لکھا۔ لیکن میرے فیصلہ سے دوسرے جوابات کا اندازہ ہو جائے گا۔ فیصلہ دیوانی میں یہ مقدمہ دیا گیا تھا کہ ایک مکان گروی ہے مرتہن کہتا ہے کہ مکان رہن بالوفا تھا۔ مدت ختم ہوگئی اس لئے مکان اب میرا ہوگیا۔ راہن کہتا ہے کہ مرتہن کا قبضہ غاصبانہ ہے دونوں طرف سے شہادت پیش ہوتی ہے، مرتہن کے گواہوں کے بیانات سے میری رائے میں رہن بالوفا ثابت تھا۔ اور راہن کی شہادت سے قبضہ غاصبانہ۔ میں نے اس کا تصفیہ یہ کیا کہ مکان منہدم کرکے زمین اور ملبہ آدھا آدھا دونوں میں تقسیم کر دیا جائے اور چونکہ یہ تمام خرابی گواہوں کے پیچیدہ بیانات سے پڑی ہے اس لئے مکان کے منہدم کرنے اور مقدمہ کا خرچہ ان سے دلایا جائے۔ میں اب بھی نہایت زور سے کہتا ہوں کہ اس سے صاف کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ نہ مرتہن کو شکایت ہے کہ میرا مقدمہ خارج ہوا۔ اور نہ راہن کو شکایت کہ اس کا مکان مفت میں دوسروں کو دیدیا گیا۔ اب اس فیصلہ پر بھی اگر ممتحن صاحب نمبر نہ دیں تو وہ جانیں اور ان کا دین ایمان جانے

فوجداری مقدمہ کی یہ صورت تھی کہ ایک جوان عورت کے خاوند کو ملازم نے مار ڈالا تھا۔ بیچاری کے دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ شہادت میں جو گواہ پیش ہوئے انھوں نے بیان کیا کہ ہم نے ملزم کو قتل کرتے ہوئے خود دیکھا ہے ایک بیان کرتا ہے کہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں کی پیٹھ ملزم اور مقتول کی طرف تھی، اول تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا بڑا واقعہ ہو رہا ہو اور یہ لوگ پیٹھ پھیرے کھڑے رہیں دوسرے جب یہ پیٹھ پھیرے کھڑے تھے تو کیا ان کی پیٹھ پر آنکھیں تھیں جو انھوں نے اس واقعہ کو دیکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں جھوٹے ہیں اس لئے میں نے یہ تجویز کی کہ ان دونوں گواہوں کو دو سال سزائے قید بامشقت اور سو سو روپیہ جرمانے کی سزا دے کر ملزم کو بری کر دیا جائے اس کے بعد میں نے دیکھا کہ بیچاری مستغیثہ بیوہ ہو گئی، اس لئے اس کے متعلق یہ حکم دیا کہ سرکاری طور پر مستغیثہ کا نکاح ملزم سے کر دیا جائے اور جو رقم جرمانہ گواہوں سے وصول ہو وہ اس نکاح میں صرف کی جائے اب رہے بچے تو ان کے متعلق یہ تجویز کی گئی کہ ملزم کو ان کے رکھنے اور پرورش کرنے میں تامل ہوگا۔ اس لئے دونوں یتیم خانہ میں بھیج دیئے جائیں اب آپ ہی فرمائیے کہ اس سے زیادہ اور کیا انصاف ہو سکتا ہے اس پر بھی اگر ممتحن صاحب مجھ کو فیل کر دیں تو اس کو ظلم نہ کہیں تو اور کیا کہیں گے، انصاف آپ ناظرین کے ہاتھ میں ہے، میں نے یہ جوابات والد صاحب کو بھی سنائے انھوں نے بہت تعریف کی ممتحنوں کو بہت برا بھلا کہا۔ میری اشک شوئی کی، اور فرمایا بیٹا کوئی گھبرانے کی بات نہیں اس سال نہیں آئندہ سال سہی۔ آخر کہاں تک بے ایمانی ہوگی۔ سو دن چور کے تو ایک دن شاہ کا خیر ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

جو کچھ ہوا سو ہوا ایک سال کی فرصت تو مل گئی۔

# تصویر کا دوسرا رخ

بلا بلفظ عرب امتحان بود یعنی
کہ بندہ را یہ بلا امتحان کند و اور

بخدا امتحان بڑی سخت چیز ہے، خدا کسی کو امتحان میں نہ ڈالے میرا تو یہ حال ہے کہ جب امتحان کا خیال آجاتا ہے تو بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جو جو مصیبتیں اس امتحان کے زمانہ میں مجھ پر گزریں وہ سب نظر کے سامنے آجاتی ہیں، میرا دل اپنے امتحان کے واقعات لکھتے ہوئے کانپتا ہے، مگر چند محبوں اور محسنوں کا اصرار ہے اس لئے مختصراً عرض کرتا ہوں۔

کسی زمانہ میں ہم لوگ بھی بڑے سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن زمانہ کی گردش نے رفتہ رفتہ اچھی طرح پیس دیا۔ اور ایک وہ زمانہ آگیا کہ ہمارے رشتہ دار بھی تعلق ظاہر کرنے سے اجتناب کرنے لگے والد صاحب قبلہ مرحوم کے زمانہ حیات تک کسی نہ کسی طرح گزرے جاتی تھی، لیکن مرحوم کی فراخدلی اور اثاثہ کی کمی نے افلاس کی آخری حد تک ہم کو پہنچا دیا تھا۔ ان کے انتقال کے وقت میری عمر کوئی سترہ سال کی تھی۔ انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ لا کلاس کا پہلا سال بھی ختم نہ ہوا تھا کہ یکایک انفلوئنزا میں ان کا انتقال ہو گیا، تمام گھر بیمار پڑا۔ بیماری کے اخراجات نے رہا سہا اور بھی ٹھکانے لگا دیا نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب سب بیماری سے اٹھے تو رہنے کا مکان بھی فروخت کرنا پڑا ایک چھوٹا سا مکان (عہ ر) کرایہ سے لیکر جا رہے، گھر میں میری والدہ صاحبہ تھیں، ہیں اور میری چھوٹی بہن رضیہ۔ اس کی عمر پانچ سال تھی۔ والدہ کے پاس سلائی کا کچھ کپڑا آتا اس سے اور تھوڑا بہت جو زیور رہا تھا، اس کو بیچ کر گزارہ کرتے جب آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہو تو قارون کا خزانہ بھی کافی نہیں ہوتا۔ تھوڑے دنوں میں جو کچھ رہا سہا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ اس عرصہ میں میری لا کلاس کی مدت بھی ختم ہو گئی، اور امتحان کا زمانہ بھی قریب آگیا اب سب سے بڑی مشکل فیس کی تھی کوئی ایسی چیز پاس نہ تھی گروی رکھ کر

یا بیچ کر رقم ادا کی جاتی، کوئی ایسا ہمت والا رشتہ دار نہ تھا۔ کہ صرف بھروسہ پر
پچاس ساٹھ روپے کی رقم دیتا، رضیہ کے پاس گلے کا ایک لچھا اور پاؤں میں پازیب
رہ گئی تھی۔ والدہ صاحبہ نے کہا کہ اسکو فروخت کر کے کام چلاؤ۔ اگر خدا نے کیا تو شاید اسی
امتحان کے بعد ہمارے دن پھریں۔ میری حمیت گوارہ نہ کرتی تھی کہ اس معصوم کا زیور لوں
لیکن کیا کیا جاتا۔ اور کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ والدہ صاحبہ جب رضیہ کا زیور اتارنے لگیں
تو وہ مچل گئی، انھوں نے سمجھانا شروع کیا کہ دیکھو بھائی جان پاس ہو جائیں گے تو
تم کو اتنا زیور بنا دیں گے تمھارے لئے گڑیاں لائیں گے تم کو اچھے اچھے کپڑے سلوا دیں گے
میں یہ سب سنتا رہا لیکن رضیہ کے ایک فقرہ نے ایسا بیتاب کر دیا کہ مجھ سے وہاں نہ
ٹھہرا گیا۔ اسکا یہ کہنا کہ اگر بھائی صاحب پاس نہ ہوئے تو "میرے دل میں تیر کی طرح لگا
گو اماں سمجھاتی رہیں کہ نہیں بیٹا ایسی فال زبان سے نہیں نکالا کرتے، وہ انشاء اللہ ضرور
پاس ہوں گے لیکن رضیہ کے الفاظ ایک تیر تھے کہ اپنا کام کر گئے، بہر حال والدہ صاحبہ نے
چنی لال مارواڑی کے پاس ساٹھ روپیہ میں دونوں چیزیں گروی کر دیں مجھے اکیاون
روپیہ دیے کہ جاؤ فیس داخل کراؤ۔ اور نو روپیہ گھر کے خرچ کیلئے رکھ لئے، قصہ مختصر
میں نے فیس داخل کر دی، رات دن محنت کرتا۔ لیکن ہر وقت یہ فکر رہتی کہ دیکھئے کیا ہوتا
ہے جب خیال آتا تو برا ہی خیال آتا، بیمار بھی پڑا، مگر دو چار روز میں اچھا ہو گیا۔ آخر
امتحان کا دن آہی گیا، اماں نے کہیں نہ کہیں سے کر کے دودھ نان پاؤ رات کو رکھ دیا تھا
کہ صبح ہی صبح کھا کر چلا جاؤں گا۔ لیکن رات کو کمبخت بلّی دودھ پی گئی، صبح کو جو والدہ صاحبہ
اٹھیں سر پکڑ کر رہ گئیں۔ گھر میں اس روز پیسہ نہ تھا میں بھی اٹھا۔ انھوں نے مجھ سے ذکر کیا
میں نے کہا اماں آپ ناحق فکر کرتی ہیں مجھے آج بھوک نہیں ہے، میں یہ کہہ کر چلا گیا،
امتحان کے کمرہ میں اپنی جگہ تلاش کر لی اور بیٹھ گیا۔ لیکن تھوڑی دیر میں بھوک کی وجہ سے
چکر آنے لگے۔ اتنے میں پرچہ تقسیم ہونا شروع ہو گیا مجھے بھی ملا۔ میں نے دیکھا لیکن ایک

سمجھ میں نہیں آیا ساتھ ہی سر میں چکر آیا۔ اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا میں نے میز پر سر رکھ دیا۔ اس غفلت میں یہ نظر آیا کہ والدہ صاحبہ رضیہ کے زیور اتار رہی ہیں وہ مچل رہی ہے۔ یہ اس کو سمجھا رہی ہیں۔ کہتی ہیں کہ بیٹا تیرے بھائی پاس ہو جائیں گے تجھ کو یہ لاکر دیں گے وہ لاکر دیں گے، رضیہ نے میری طرف غور سے دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "اور جو یہ پاس نہ ہوئے تو" میرا سلسلۂ خیالات یہیں تک پہنچا تھا کہ کسی نے آواز دی کہ "جناب یہ امتحان کا کمرہ ہے سونے کی جگہ نہیں ہے" میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو ایک صاحب مسکراتے ہوئے میری طرف آئے اور کہا کہ آپ امتحان دینے آئے ہیں یا سونے آئے ہیں میں کھڑا ہو کر کچھ جواب دینا چاہتا تھا کہ میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے، انھوں نے دوڑ کر مجھے سنبھالا۔ اور چپراسی کو آواز دی کہ پانی لاؤ پانی آیا تو مجھے پلایا۔ اس وقت میرے حواس کچھ درست ہوئے پرچہ کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ رضیہ کا فقرہ یاد آیا۔ اور "جو یہ پاس نہ ہوئے تو" اس کا یاد آنا تھا کہ گذشتہ واقعات آنکھوں کے سامنے پھر گئے اور ساتھ ہی کمرہ بالکل تاریک معلوم ہونے لگا۔ نگراں کار صاحب یہ کیفیت برابر ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے کچھ سوچ کر میری طرف بڑھے اور کہا۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہوشیار بھی ہیں اور ذہین بھی۔ اور محنت بھی کی ہے لیکن آپ کی اس حالت کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، کیا آپ بیمار ہیں میں نے کہا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ کیا آج آپ بھوکے تو نہیں ہیں۔ یہ لفظ سننے تھے کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں چپکا ہو گیا انھوں نے پھر وہی سوال کیا میں نے کہا جی ہاں میں آج کھانا کھا کر نہیں آیا۔ انھوں نے کہا کیوں، پہلے تو میں خاموش رہا جب انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو میں نے بہت نیچی آواز میں کہا کہ "گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا" معلوم ہوتا ہے کہ بے اختیار ان کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے "کیا گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا" میں نے کہا جی ہاں کچھ نہ تھا میں نے ان کی طرف نظر اٹھائی انکی آنکھیں

ڈبڈبائی ہوئی تھیں، اور چہرہ پر ایک قسم کی سرخی دوڑ گئی تھی۔ انھوں نے اسی وقت چپراسی کو آواز دی کہ نیچے ہوٹل سے جا کر ایک پیالی چائے تھوڑے سے بسکٹ اور دو تین سنبوسے لے آؤ۔ یہ کہہ کر وہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس گئے اور ان سے کچھ کہہ کر میری طرف آئے اور کہا میرے ساتھ آئیے۔ پرچہ کا خیال نہ کیجئے پہلے کچھ ناشتہ کر لیجئے، بعد میں پرچہ بھی ہوتا رہے گا میں نے انکار کیا وہ زبردستی مجھ کو سپرنٹنڈنٹ صاحب کی میز کے پاس لے گئے، وہاں قریب ہی ایک چھوٹی میز پر چائے وغیرہ رکھی ہوئی تھی مجھ سے کہا آپ اچھی طرح ناشتہ کر لیجئے، خالی پیٹ ہے پرچہ کیا خاک سمجھ میں آئے گا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور چائے پینے لگا۔ انھوں نے باتوں ہی باتوں میں تمام حالات پوچھ لئے اور کہنے لگے تمھاری والدہ اور بہن کا کیا حال ہو گا۔ میں نے عرض کیا کہ سلائی کے آج کچھ پیسے آنے والے ہیں، خدا دن گزار دے گا۔ انھوں نے کہا اور اگر آج پیسے نہ آئے تو، میں نے کہا ایسی حالتیں ہم غریبوں پر اکثر گذرتی ہیں بہر حال چائے کی پیالی پی کر میرے اوسان درست ہوئے۔ انھوں نے اصرار کر کے دو چار بسکٹ بھی کھلائے اور کہا اب آپ اپنی جگہ پر بیٹھئے مگر گھبرائیے نہیں پرچہ آسان ہے پرچہ سے غرض رکھئے گذشتہ اور آئندہ واقعات کو دل میں نہ لائیے۔ انشاءاللہ آپ کامیاب ہوں گے اور ضرور کامیاب ہوں گے پرچہ کے بعد دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیے میں یہ بھی دیکھ لوں گا کہ آپ نے پرچہ کیسا لکھا میں اپنی جگہ پر آ کر بیٹھا۔ پرچہ دیکھا تو واقعی آسان تھا میرے محسن تھوڑی دیر کے بعد میرے پاس آتے اور کہتے آپ گھبرائیے نہیں خدا مسبب الاسباب ہے کوئی نہ کوئی صورت آپ کی بہتری کی نکال دے گا۔ ایک بجے مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ساتھ میں نے اور انھوں نے بیٹھ کر کھانا کھلایا، انھوں نے پوچھا کہ کون صاحب ہیں انھوں نے کہا کہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کا لڑکا ہے، میں کچھ بولنا چاہتا تھا۔ مگر ان کے تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا

بہر حال میں نے دوسرا پرچہ بھی بہت اچھا کر دیا اور نگراں کار صاحب سے مل کر اپنے گھر کو روانہ ہوا۔ گھر پہنچا تو دیکھا والدہ صاحبہ جا نماز پہ بیٹھی ہیں رضیہ ان کے برابر بیٹھی ہے۔ وہ دعائیں مانگ رہی ہیں اور رضیہ آمین کہہ رہی ہے پہلے تو انھوں نے میری نیک ہدایتی اور کامیابی کی دعا مانگی۔ اس کے بعد جو دعا مانگی اس سے مجھے حیرت ہوئی فرمانے لگیں یا الہ العالمین جس نے اس مصیبت میں ہماری خبر گیری کی ہے تو ہر مصیبت سے اس کو بچائیو۔ رضیہ نے کہا آمین۔ یا میرے پروردگار جس نے میرے بچوں کا دکھ درد سمجھا تو اس کو ہر دکھ سے محفوظ رکھیو۔ یا باری تعالیٰ جس نے ہم دکھیاروں کی اس بے کسی میں مدد کی تو ہر حال میں اس کی مدد کیجیو یا الہ العالمین اپنے حبیب پاک کے صدقہ سے اس کو ہر آفت سے بچا۔ اس کی بیوی بچوں کو خوش خرم رکھیو اور جس طرح اس نے ہم غریبوں کے ساتھ سلوک کیا اس کے ساتھ سلوک کر، رضیہ برابر آمین کہتی جاتی تھی جب والدہ صاحبہ دعا سے فارغ ہوئیں تو انھوں نے پیٹھ پھیری مجھے کھڑا پایا، فرمایا کہو بیٹا پرچے کیسے کر کے آئے میں نے کہا بہت اچھے لیکن اگر ایک صاحب میری وقت پر مدد نہ کرتے تو خدا جانے کیسی گزرتی، انھوں نے واقعات پوچھے۔ میں نے بے کم و کاست بیان کر دئیے۔ وہ یہ سنتے ہی سجدہ میں گر پڑیں اور بڑی دیر تک رو رو کر چپکے ہی چپکے دعائیں مانگتی رہیں، سجدہ سے سر اٹھا کر انھوں نے جا نماز کے نیچے سے ایک خط نکالا اور کہنے لگیں ہو نہ ہو یہ بھی وہی فرشتہ رحمت ہے میں نے یہ خط دیکھا لکھا تھا " جناب ہمشیرہ صاحبہ تسلیم! افسوس ہے کہ آج کل ہم لوگ باہمی میں کچھ ایسے گرفتار ہو گئے ہیں کہ اپنے غریب اور شریف بھائی بہنوں کی خبر رکھنا اور لینا بے ضرورت سمجھتے ہیں میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے بعد اگر اپنے مقدور کے موافق میں آپ کی امداد نہ کروں تو باری تعالیٰ کو کیا جواب دے سکوں گا۔ یہ معلوم کرنے کے بعد رضیہ سلمہا کے زیور کس طرح اور کیوں گروی ہیں اگر میرے بال بچے زیور نہ پہنیں

تو کس منھ سے میں اس غریب نواز حضرت رسالتماب کے سامنے جاؤں گا جو کچھ اسوقت مجھ سے ہو سکا وہ گذارتا ہوں۔ قرض حسنہ سمجھ کر قبول فرمایئے۔ ماشاءاللہ آپ کا بچہ بڑا ہوشیار ہے، وہ ادا کر دیگا اور اگر نہ ادا کیا تو میں اسے معاف کرتا ہوں لیکن آپ خدا کے لئے رضیہ کا دل نہ توڑیئے، اس کا زیور منگوا دیجئے۔ کیونکہ جب تک میں یہ نہ سن لوں کہ اس کا زیور اس کو مل گیا۔ مجھے چین نہ آئے گا۔ دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ مجھ کو اپنے غریب بھائی بہنوں کی مدد کی توفیق عنایت فرمائے۔"

خط کے ساتھ سو روپے کے نوٹ تھے۔ اماں فرمانے لگیں کہ آج تین بجے کے قریب ایک چپڑاسی آیا تھا۔ یہ دے کر اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ بیگم صاحبہ کا خط ہے ابھی کھول کر اسکو پڑھ لیں۔ مضمون سے تو سمجھ میں آتا تھا کہ میرے نام کا ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا تھا کہ کون اللہ کا نیک بندہ ہے۔ چلو تمہارے بتانے سے یہ بھی معلوم ہو گیا۔ میں نے کہا اماں اس طرح روپیہ لینا ٹھیک نہیں، بہتر ہو گا کہ کل میں واپس کر دوں، والدہ صاحبہ نے کہا کہ نہیں بیٹا ہرگز نہیں۔ اس طرح روپیہ واپس کرنے سے ان کی توہین ہو گی تم ان کا شکریہ ادا کر دو اور کہہ دو کہ" بھائی یہ تمہارا قرضہ ہے، خدا تمہیں اس کی جزائے خیر دے، تم نے ہم بے وارثوں کا وقت پر ہاتھ پکڑا۔ ہم اور ہماری اولاد ہمیشہ تمہارے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہ ہوں گے۔ اور ان سے یہ بھی کہدینا کہ بھائی ہم کیا اور ہماری دعا کیا۔ لیکن اس دکھیارے دل سے مرتے دم تک جو دعا نکلے گی وہ تمہارے اور تمہارے بال بچوں ہی کے لئے نکلے گی۔ میں خاموش ہو گیا۔ پھر فرمانے لگیں بیٹا جا چنی لال کو روپیہ دے کر رضیہ کا زیور لے آ، اس معصوم کے دل سے خوش ہو کر دعا نکلے گی تو انشاءاللہ ہمارے محسن کا دین و دنیا دونوں میں بھلا ہو گا۔ میں چنی لال سے دونوں چیزیں چھڑا کر لایا۔ والدہ صاحبہ نے رضیہ کو پہنایا۔ وہ ایسی خوش ہوئی کہ کیا بیان کروں کہنے لگی" کیا بھائی جان پاس ہو گئے"۔ اماں نے کہا انشاءاللہ اب پاس ہو جائیں گے، بیٹا تم دعا مانگو کہ جس نے

نہیں یہ چیزیں واپس دلوائیں۔ خدا اس کو دونوں جہان میں جزائے خیر دے غرض اماں کہتی جاتی تھیں اور رضیہ دعائیں مانگتی جاتی تھی۔ اس عرصہ میں مغرب کا وقت ہوگیا۔ نماز پڑھنے کے بعد جب میں نے دعا کے لیئے ہاتھ اٹھائے تو دن کے تمام واقعات یاد آگئے میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ زبان یاری نہ دیتی تھی اماں نے جو میری یہ حالت دیکھی فرمانے لگیں "ہاں بیٹا یہی دعا کا وقت ہے۔ اپنے اور میرے لیئے کچھ نہیں اپنے محسن کے لیئے دعا کر خدا قبول کریگا" بہرحال نماز سے فارغ ہوکر میں کتاب دیکھنے لگا اور کوئی بارہ بجے سوگیا۔ صبح اٹھ کر پھر امتحان میں گیا۔ دروازہ ہی پر نگراں کار صاحب ملے۔ میں ان سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کہ انہوں نے مجھے روک دیا اور کہا میاں صاحبزادے اب میں تمہارا مہاجن ہوں، تم کو جب ضرورت ہو مجھ سے بے تکلف لیجانا مگر یاد رکھنا کہ تم سے یہ رقم مارواڑیوں سے زیادہ سختی سے وصول کروں گا"

کھانے کے وقت پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور ساتھ ہی کھانا کھلایا میں نے جو کچھ والدہ صاحبہ نے کہا تھا ان سے عرض کیا کہنے لگے "میاں اس ماں کی قدر کرو جو مصیبتیں اٹھا اٹھا کر تم کو پال رہی ہے ایسا نہ کرنا کہ آئندہ یہ تمام واقعات بھول جاؤ اور بیوی کے سامنے ماں کو کونے میں بٹھا دو" غرض اسی طرح وہ مجھے نصیحتیں کرتے رہے آج کے پرچے بھی میں نے بہت اچھے کیئے اور خدا خدا کر کے امتحان ختم ہوا اب نتیجہ کے انتظار میں ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہوگیا۔ آخر ایک دن معلوم ہوا کہ ہفتہ کے دو بجے نتیجہ شائع ہوگا۔ میں بھی بحالت امید و بیم پہنچا، دیکھا کہ نوٹس بورڈ پر نتیجہ لگا ہوا ہے اور سامنے سیکڑوں امیدوار کھڑے دیکھ رہے ہیں میں نے بھی گھس گھسا کر نتیجہ دیکھنا شروع کیا۔ لیکن میرے نام کا نمبر نہیں۔ کئی دفعہ دیکھا لیکن نام کا پتہ نہ چلا آخر مایوسی کی حالت میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں کسی نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا پھر کر دیکھوں تو وہی میرا فرشتہ رحمت، ہنس کر کہنے لگے۔ "کہو پاس ہوگئے"، میں نے کہا نہیں

انہوں نے نوٹس بورڈ جا کر دیکھا اور میرے پاس آکر کہنے لگے "ارے میاں تمہارا نام تو سب سے اول تھا کسی دل جلے نے اوپر کا حصہ پھاڑ دیا ہے۔ مجھے یقین نہ آیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر رجسٹرار صاحب کے پاس لے گئے اور اصل رجسٹر میرے سامنے رکھ کر کہا لو دیکھ لو۔ اور اطمینان کر لو۔ مگر میاں ہم مٹھائی ضرور کھائیں گے یہ نہ ہو کہ پاس ہونے کے بعد ہم کو سوکھا ہی ٹال دو۔ رجسٹرار صاحب نے بھی مبارکباد دی اور میرے پرچوں کی بہت تعریف کی۔ خیر میں خوشی خوشی گھر پہنچا۔ والدہ صاحبہ سے جاکر کہا، وہ بڑی دیر تک مجھے گلے سے لگا کر روتی رہیں کہ اتنے میں کسی نے آکر کہا کہ ایک زنانی گاڑی دروازہ پر کھڑی ہے، باہر جاکر پوچھا تو معلوم ہوا کہ میرے محسن کی بیوی میری والدہ کو مبارکباد دینے آئی ہیں، خیر ان کو اتروا کر میں تو باہر چلا گیا ایک گھنٹہ بعد واپس آیا تو معلوم ہوا وہ تشریف لے گئیں اور میری والدہ سے کہہ گئیں کہ کل آپ کی اور آپ کے صاحبزادے اور صاحبزادی کی میرے یہاں دعوت ہے گاڑی آئے گی آپ ضرور آیئے۔ دوسرے روز سہ پہر کو گاڑی آئی اور ہم لوگ سوار ہو کر وہاں پہنچے جاکر دیکھتا ہوں کہ بیسیوں گاڑیاں اور موٹریں دروازہ پر کھڑی ہیں اور ایک بڑے ایٹ ہوم کا انتظام ہے۔ شہر کے اکثر عہدہ دار اور بڑے بڑے وکیل جمع ہیں۔ میرے محسن نے میرا تعارف سب سے کرایا، ہر ایک سے یہی کہتے تھے کہ میرے ایک مرحوم عزیز دوست کا لڑکا ہے تھوڑی دیر باتیں ہونے کے بعد سب لوگ میز پر گئے اور ہنسی خوشی وقت گزر گیا۔ کھانا ختم ہونے کے بعد میرے محسن نے کہا "مجھو"، ایٹ ہوم میں کسی اسپیچ دینے کا دستور نہیں ہے۔ لیکن خاص حالات کی وجہ سے میں اس طریقہ کے خلاف کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں دعوت کے کارڈ گو میری طرف سے تقسیم ہوئے ہیں لیکن اصل داعی اس دعوت کے (میری طرف اشارہ کر کے) یہ ہیں۔ انہوں نے اس خیال سے کہ آپ صاحبوں سے انکی پہلی ملاقات نہ تھی۔ یہ ذمہ داری میرے سر رکھی اور میں نے اس خیال سے اسکو قبول کیا کہ اس طرح آپ لوگوں سے میں ان کا تعارف کرا سکونگا۔ یہ آپ صاحبوں کو معلوم ہے

کہ اس سال کے امتحان وکالت میں یہ سب سے اول رہے ہیں اور اس بات کا میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ یہ نہایت شریف محنتی ایماندار اور سمجھدار شخص ہیں اور مجھے یقین کامل ہے کہ ابتدائے وکالت ہی میں اگر میرے عزیز دوستوں میں سے کسی نے انکو اپنے ساتھ لے لیا اور آپ صاحبوں نے انکی بہبودی اور جائز رعایت کا خیال پیش نظر رکھا تو یہ ایک ہوشیار اور کامیاب وکیل ثابت ہونگے کیا میرے عزیز دوستوں میں سے کوئی میری اس استدعا کو قبول فرمائیں گے،، اس اسپیچ کے ختم ہوتے ہی شہر کے سب سے ممتاز وکیل یعنی مولوی اصغر خاں صاحب اٹھے اور کہا ،، میرے عزیز فیاض دوست نے اس نوجوان دوست کے تمام واقعات مجھ سے بیان کر دیئے ہیں میں اپنے اس نوجوان دوست کی مدد کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہوں اور نہایت خوشی سے اپنے ساتھ وکالت میں شریک کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی ان سے یہ ضرور خواہش کرونگا کہ یہ اپنے تمام واقعات بے کم وکاست چھپوا دیں تاکہ ہم لوگوں کو جو روپے کو بے دریغ لٹا رہے ہیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے اکثر بھائی اور بہنیں کس مصیبت میں ہیں اور کس طرح غربت بسا اوقات ہمارے جواہر پاروں کو خاک میں ملا دیتی ہے، اور کس طرح ہم لوگ اپنی ہمدردی کے فرض کو بھول کر روپے کو بے غل وغش واہیات اور خرافات میں تباہ کر رہے ہیں اسکے بعد میں نے کھڑے ہوکر بہت مختصر الفاظ میں وکیل صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ اور اپنے واقعات کو طبع کرانے کا وعدہ کیا۔ اپنے محسن کے متعلق کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میرا گلا بند ہو گیا۔ اور میں ایک حرف نہ بول سکا یہ دیکھ کر وہ خود اٹھے مجھے گلے سے لگا لیا اور کہا میاں صاحبزادہ میری تعریف کرنے کی ضرورت نہیں اگر مجھے معلوم ہوا کہ تم نے کبھی اپنے کسی بھائی کی بروقت مدد کی تو میں سمجھ لونگا کہ احسان کا بدلہ احسان سے ہو گیا، جاؤ اب محنت کرو عدالت کا ادب کرو اپنے ہم پیشہ بھائیوں سے مل جل کر کام کرو، اپنے موکلین کی دلجوئی کرو سچ پر قائم رہو، خدا تم کو کامیاب کریگا۔ اس دعوت میں جو وعدہ میں نے کیا تھا

اس کی تعمیل میں میں نے یہ اپنے حالات لکھے ہیں خدا کرے ان کے پڑھنے سے دوسرے سبق حاصل کریں اور ہم لوگوں میں وہ اسپرٹ پیدا ہو جائے جو میرے محسن میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ میری وکالت بہت اچھی چل رہی ہے۔ مگر آپ کو باور کراتا ہوں کہ جب امتحان کا خیال آتا ہے تو میرا دل لرز جاتا ہے۔

# سنہ ۱۲۶۱ ہجری میں دہلی کا ایک مشاعرہ

## تمہید (۱)

نام نیک رفتگان ضائع مکن تا بماند نام نیکت برقرار

بقول غالب مرحوم انسان "ایک محشرِ خیال ہے لیکن خیال میں حشر برپا ہونے کیلئے کسی بیرونی تحریک کا ہونا لازمی ہے، دماغ خیال کا گنجینہ ہے لیکن اس گنجینے کے کھلنے کے واسطے کسی ظاہری اسباب کی کنجی کی ضرورت ہے، مجھے بچپن سے شعرائے اردو کے حالات پڑھنے اور سننے کا شوق رہا ہے، مگر کبھی کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی جو انکے حالات کو ایک جگہ جمع کرنیکا خیال پیدا کرتی، اور یہ خیالات الفاظ کی شکل میں ظاہر ہو کر ایک خوشنما چلتی پھرتی تصویریں ہوں۔

جب کوئی بات ہونے والی ہوتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اتفاق دیکھیے کہ پرانے قدیم کاغذات میں مجھ کو حکیم مومن دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی، تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ تو بھی محمد حسین آزاد مرحوم کے "نیرنگ خیال" کی محفل شعرا کی طرح ایک مشاعرہ قائم کر مگر ان لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کے بجائے صرف ان کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا۔ خیال میں رفتہ رفتہ پختگی ہوئی۔ اور اس "پختگی خیال" نے ایک مشاعرہ کا خاکہ پیش نظر کر دیا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مختلف زبانوں کے شاعروں کو کس طرح ایک جگہ جمع کر دوں اس عقیدے کو امیر اللہ مرحوم کے اس شعر نے حل کر دیا۔

جوانی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

اس شعر کا دل میں آنا تھا کہ شعرائے دہلی کا آخری دور آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور دل میں یہ بات جم گئی کہ بجائے تمام شعرائے اردو کے دہلی کے آخری دور کا نقشہ کھینچ دیا جائے

قاعدے کی بات ہے کہ مرنے سے پہلے بیمار سنبھالا لیتا ہے اردو شاعری کے حق میں بہادر شاہ ثانی کا زمانہ بھی دہلی کا سنبھالا تھا۔ بادشاہت برائے نام تھی اور جو تنخواہ بادشاہ سلامت کو ملتی تھی اس میں قلعہ کا خرچ بھی مشکل سے چلتا تھا۔ برخلاف اسکے دکن اور اودھ میں دولت کی گنگا بہہ رہی تھی، پھر بھی "دریائے جمنا کی چمکیلی ریت" دہلی والوں کے لئے نظر فریب رہی اور اس "اجڑے دربار" میں شعرا ہی نہیں ہر فن کے کاملوں کا ایک ایسا مجمع ہو گیا جس کی نظیر ہندوستان تو ہندوستان دوسرے ملک میں بھی دشوار ہے۔

زمانہ ایک رنگ پر نہیں رہتا۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ان کاملین فن سے بہت سے تو ملک عدم کو سدھارے جو بچے کھچے رہ گئے تھے ان کو غدر کے طوفان نے تتر بتر کر دیا جس کو جہاں کچھ سہارا امداد ہیں کا ہو رہا۔ دہلی برباد ہو کر حیدر آباد اور رامپور آباد ہوئے اکثر شرفا گھروں سے ایسے نکلے کہ پھر ان کو دہلی کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی جو رہ گئے ہیں وہ چلنے چلانے کو تیار بیٹھے ہیں، بہت سے اٹھتے جاتے ہیں اور ایک زمانہ وہ آنے والا ہے کہ کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہے گا۔ کہ مومن مرحوم کا مکان کہاں تھا۔ جس طرح سوائے میرے اب شاید کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی قبر کہاں ہے۔

ان چراغ ہائے سحری کو دیکھ دیکھ کر مجھے خیال آیا (اس خیال کی محرک مومن مرحوم کی تصویر بھی ہوئی) کہ "اردو" کے لئے ان سے ایک ایسا تو چراغ روشن کر لوں جس کی روشنی میں آنے والی نسلیں زبان اُردو کے محسنوں کی شکلیں (خواہ وہ دھندلی ہی کیوں نہ سہی) دیکھ سکیں اور ان کا کلام پڑھتے وقت کم سے کم ان کی صورتوں کا ایک موہوم سا نقشہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے، جو لوگ علمی مذاق رکھتے ہیں وہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ کسی کا کلام پڑھتے وقت اگر اس کی شکل و صورت، حرکات و سکنات، آواز کی کیفیت، نشست و برخاست کے طریقے، طبیعت کا رنگ اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کے لباس اور وضع کا خیال دل میں رہے تو اس کا کلام ایک خاص اثر پیدا کر دیتا ہے۔ اور پڑھنے کا لطف دوبالا

ہو جاتا ہے۔ ورنہ مصنف کے حالات سے واقف ہوئے بغیر اس کی کسی کتاب کا پڑھ لینا گراموفون کے ریکارڈ سننے سے زیادہ موثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل مہذب ممالک کے کسی مصنف کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی جس کے شروع میں ان کے حالات درج نہ کئے جائیں اور وہ واقعات نہ دکھائے جائیں جن کی موجودگی میں وہ تصنیف ضبط تحریر میں آئی۔

یہی خیالات تھے جنہوں نے مجھے ان چند اوراق کے لکھنے پر آمادہ کیا، اور اس البم میں آپ ایسی بہت سی تصویریں دیکھیں گے جو ان کاملین فن نے اپنے ہاتھ سے خود کھینچی ہیں۔ بہت سے ایسے مرقع پائیں گے جو دوسرے مصوروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں بعض ایسے نقش و نگار ملیں گے جو فوٹو یا قلمی تصاویر دیکھ کر الفاظ میں اتارے گئے ہیں اکثر و بیشتر ایسی صورتیں ہوں گی جو خود میں نے بڑے بوڑھوں سے پوچھ کر بنائی ہیں لیکن ہر صورت میں تائید کے مقابلہ میں شہادت تردیدی کو زیادہ وقعت دی ہے۔ یعنی اگر کسی واقعہ کے متعلق ایک بھی مخالف بات ہوئی تو اس واقعہ کو قطعاً ترک کر دیا۔

اگر اتنے سارے جیلے ایک جگہ ہی جمع ہو جاتے تو یقیناً یہ مضمون فوج کے چہروں کا رجسٹر بن کر بے لطف ہو جاتا۔ لیکن ادھر تو آزاد مرحوم کے نیرنگ خیال نے دل میں مشاعرہ کا خیال ڈالا۔ ادھر کریم الدین مغفور کی کتاب طبقات الشعرائے ہند کے طبقہ چہارم نے رجب ۱۲۶۱ھ ہجری کے ایک مشاعرہ کا پتہ دیا۔ اب کیا تھا دونوں کو ملا کر ایک مضمون پیدا کر لیا۔ رہی رنگ آمیزی اس کی تکمیل میں خود کر دیتا ہوں البتہ اچھے برے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔

بحیثیت مؤرخ ۱۲۶۱ھ کے واقعات میں خود اس طرح لکھ سکتا تھا۔ گویا یہ سب میرے چشم دید ہیں اور

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام     ہفتصد و ہفتاد قالب دیدہ ام

پر نظر رکھتے ہوئے اس زمانہ کا بھی "مرزا صاحب" بن سکتا تھا۔ مگر میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ کریم الدین مرحوم کی کامیابی کا سہرا اپنے سر پر باندھوں اور ایسے شخص کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دوں جس نے اپنے مشاعرے میں بہت بڑا حصہ لیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی یہ مجلس محدود تھی۔ اور میں نے اس کو اتنی وسعت دی ہے کہ اس وقت کے تقریباً سب بڑے بڑے شعراء کو اس میں لا بٹھایا ہے۔ اب اس میں مجھے کامیابی ہوئی یا نہیں اس کا اندازہ قارئین کرام فرما سکتے ہیں۔ اگر ہوئی ہے تو زہے نصیب میری محنت ٹھکانے لگی۔ اگر نہیں ہوئی تو کم سے کم یہی سمجھ کر میری داد دی جائے کہ مرزا صاحب نے بات تو اچھی پیدا کی تھی۔ مگر نباہ نہ سکے۔ جو ان سے نہیں ہوا وہ اب ہم کر دکھاتے ہیں ممکن ہے کہ اس طرح کوئی قلم کا دھنی ان "خفتگان خاک" کا ایک ایسا مرقع تیار کر دے جو بزم ادب اردو میں سجانے کے قابل ہو۔

لیجیے "میں" اب مولوی کریم الدین صاحب کی جون میں حاضر خدمت ہوتا ہوں، لیکن یہ ضرور عرض کئے دیتا ہوں کہ جب میں اپنی تمام محنت کریم الدین صاحب" کے نذر کر رہا ہوں تو کچھ برا بھلا آپ کو اس مضمون کے متعلق کہنا ہے وہ مجھے نہ کہیئے مولوی صاحب کو کہیئے اور خوب دل بھر کر کہیئے۔ میں خوش اور میرا خدا خوش والسلام

"مرزا فرحت اللہ بیگ"

# ۲- تدبیر

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

میرا نام کریم الدین ہے۔ میں پانی پت کا رہنے والا ہوں۔ یہ قصبہ دہلی سے ۴۰ کوس پر بجانب شمال مغرب واقع ہے اور اپنی لڑائیوں کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہے۔ ہم اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مولویوں کا خاندان تھا۔ لیکن زمانہ کی گردش نے ایسا پیسا کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔ جائیداد ضبط ہو گئی۔ میرے دادا صاحب قبلہ ایک مسجد میں جا بیٹھے اور اللہ اللہ کرکے گزار دی۔ جب ضبط شدہ جائدادوں کے متعلق دریافت شروع ہوئی تو توکل نے ان کا دامن پکڑ لیا۔ اپنی جگہ سے نہ ہلے نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لئے روٹیوں کا سہارا کھو بیٹھے میرے والد سراج الدین مرحوم بمصداق عصمت بی بی از بے چادری متوکل بنے رہے اور مسجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کر اٹھے۔ میں ۱۲۳۴ھ میں عین عید الفطر کے دن پیدا ہوا۔ میری تعلیم انہی دونوں بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی۔ لیکن بے چین طبیعت اور خاندانی جھگڑوں نے آخر پانی پت چھڑا دیا اس زمانہ میں دہلی میں علم کا بڑا چرچا تھا۔ ہر فن کے کاملوں سے دہلی بھری پڑی تھی۔ ہر سمت علم کے چشمے جاری تھے۔ ملا کی دوڑ مسجد میں بھی پانی پت چھوڑ دہلی میں آ گیا۔ شہر میں چھاپے خانے نئے نئے چلے تھے۔ کاپی نویسی سے گزارا کرتا۔ محنت مزدوری کے بعد بھی ذوق علم ہر حلقہ درس میں مجھے لے جاتا اسی زمانے میں دہلی کالج کی تنظیم جدید ہوئی تھی، طالب علموں کی تلاش تھی۔ میں بھی ۱۸ سال کی عمر میں وہاں شامل ہو گیا۔ سولہ روپے وظیفہ بھی مقرر ہوا۔ اور اس طرح میں نے علم کی پیاس بڑی حد تک بجھائی۔ لیکن یہ وہ زمانہ نہیں تھا۔ کہ علم کو علم کے لئے حاصل کیا جاتا اب اسکے ساتھ گزارہ کی بڑی شق لگ گئی تھی اس لئے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک مطبع کھولا۔ قاضی کے حوض پر مبارک النساء بیگم کی حویلی کرایہ پر لی۔ عربی کی مشہور کتابوں کے

ترجمے چھاپے۔ لیکن مطبع جیسا چلنا چاہیئے تھا نہ چلا۔ یہ اردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے خیال آیا کہ ایک مشاعرہ کر کے شعرا کے حالات اور ان کا کلام طبع کرادوں، ممکن ہے کہ اس طرح مطبع چل جائے۔ مجھے شاعری سے نہ کبھی لگاؤ تھا اور نہ اب ہے۔ بلکہ شعر کہنا میں برا جانتا ہوں کیونکہ اہلِ علم کا یہ پیشہ نہیں ہے وہ لوگ جو معیشت سے فارغ البال ہیں اپنے دل بہلانے اور حسرت نکالنے کے لئے شاعری کرتے ہیں۔

میں خود عالم ہوں، میرے باپ دادا عالم تھے، بھلا میں تو اس قسم کے فضولیات کی طرف توجہ بھی نہ کرتا، مگر کیا کروں، ضرورت سب خیالات پر حاوی ہوگئی اور مجھے قیام مشاعرہ پر مجبور کیا۔ لیکن بڑی مصیبت یہ ہے کہ ایک تو اس شہر میں غریب اور خاص کر پردیسی۔ غریب کو منھ نہیں لگاتے، دوسرے یہ کہ میری جان پہچان تھی تو مولویوں سے وہ بھلا اس معاملہ میں میرا کیا ساتھ دے سکتے تھے۔ سوچتے سوچتے نواب زین العابدین خاں عارفؔ پر نظر پڑی، ان سے دو چار دفعہ ملنا ہوا تھا۔ بڑے خوش اخلاق آدمی ہیں۔ لال کنوئیں کے پاس ایک حویلی ہے اس کو مدرسہ بھی کہتے ہیں، وہاں رہتے ہیں۔ کوئی ۳۰ سال کی عمر ہے۔ گوری رنگت اونچا قد اور نہایت جامہ زیب آدمی ہیں۔ البتہ داڑھی بھر کر نہیں نکلی ہے۔ ٹھڈی پر کچھ گنتی کے بال ہیں۔ غالبؔ کے بھانجے بھی ہیں اور شاگرد بھی کچھ عرصہ تک شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی ہے، بہرحال ان کی محبت انکی شرافت اور سب سے زیادہ ان کے رسوخ نے مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور اس بارے میں انکی امداد حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ ایک روز صبح ہی صبح گھر سے نکل ان کے مکان پر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب وزیر اعظم کے مکان پر تشریف لیگئے ہیں۔ حکیم صاحب کا مکان سرکی والوں ہی میں تھا۔ واپسی میں دروازے پر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نواب زین العابدین خاں اندر ہیں۔ چوبدار کے ذریعے سے اطلاع

کرائی۔ انہوں نے اندر بلا لیا۔ بڑا عالیشان مکان ہے صحن میں نہر ہے، سامنے بڑا چبوترہ ہے اور چبوترے پر بڑے بڑے دالان در دالان، مکان خوب آراستہ پیراستہ ہے، ہر چیز سے امارت ٹپکتی ہے، سامنے گاؤ تکیہ سے لگے نواب صاحب بیٹھے تھے، میں نے ان کو پہچانا بھی نہیں، سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ اور چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ میں نے سلام کر کے کیفیت پوچھی، کہنے لگے۔ مولوی صاحب کیا کہوں کچھ دل بیٹھا جاتا ہے۔ بظاہر کچھ مرض بھی معلوم نہیں ہوتا علاج کر رہا ہوں مگر بے نتیجہ بھئی اب ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے کچھ دنوں دنیا کی ہوا کھا رہے ہیں۔ مگر یہ تو کہیئے آج آپ کدھر نکل آئے" میں نے واقعات کا اظہار کر کے ضرورت بیان کی۔ تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر ایک آہ بھر کر کہا میاں کریم الدین کو بات تو اچھی سوجھی ہے۔ مگر بھئی اس کا نباہنا مشکل ہے، تمہیں خبر نہیں دہلی کے پہلے مشاعروں نے کیا کچھ دلوں میں فرق ڈال دیئے ہیں۔ دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں یہاں کے سب کاملین فن جمع ہو جائیں۔ مگر مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی معلوم نہیں ہوتی۔ اچھا تم بھی کوشش کرو، میں بھی کرتا ہوں ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے۔ ہاں ٹھہرو حکیم صاحب کو آنے دو ایک تجویز ذہن میں آئی ہے اگر چل گئی تو میری بھی آخری تمنّا پوری ہو جائے گی اور تمہارا کام بھی نکل جائے گا۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب نکل آئے، گورے چٹے آدمی ہیں سفید بھری ہوئی داڑھی گول چہرہ اس میں کچھ چیچک کے داغ، آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی، سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنے ہوئے تھے، فن طب میں کامل اور تاریخ کے عالم ہیں، میں آداب بجا لایا میری طرف مسکرا کر دیکھا اور نواب سے کہا" آپ کی تعریف کیجیئے۔ انہوں نے کہا" یہ میرے قدیم ملنے والوں میں سے ہیں" خود شاعر نہیں مگر سخن فہم ہیں۔ آجکل خیال پیدا ہوا ہے کہ شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھیں اور اس میں ان کے حلیے اور ان کے کلام کے نمونے

دکھائیں، مجھ سے مشورہ کرنے آئے تھے۔ آپ جانتے ہیں مجھے ان چیزوں سے عشق ہے اب اپنا آخری وقت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پرانے رنگ کا مشاعرہ اور دیکھ لوں اگر آپ مدد فرمائیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ حکیم صاحب کہنے لگے "میاں عارف خدا کے لئے تم ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو ابھی جوان ہو انشاء اللہ خود طبیعت مرض پر غالب آجائے گی۔ اور نہیں مرض ہی کیا ہے وہم ہی وہم ہے۔" مگر ہاں یہ تو بتاؤ تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو۔" نواب صاحب نے کہا حکیم جی اور کچھ نہیں اتنا کردو کہ میاں کریم الدین کو بارگاہ جہاں پناہی تک پہنچا دو میں خود جاتا مگر ہمت نہیں، میں ان کو سب کچھ سمجھا دوں گا۔ اگر حضرت ظل اللہ اپنا کلام بھیجنے پر راضی ہو گئے تو مشاعرہ کا جم جانا کوئی مشکل کام نہیں، اگر بدقسمتی سے انکار ہو گیا تو پھر مشاعرہ کا خیال کرنا ہی فضول ہے اب رہا مشاعرہ کا انتظام وہ میں خود کرلوں گا۔ کیونکہ یہ بیچارے ان چیزوں کو کیا سمجھیں حکیم صاحب پہلے تو کچھ سوچتے رہے پھر کہا، عارف! تمہارے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، اس لئے اور بھی کرونگا کہ اس سے تمہاری طبیعت بہل جائیگی اور کچھ دنوں اس مشغلے میں لگ کر ممکن ہے کہ تمہارے دل سے مرض کا وہم جاتا رہے بادشاہ سلامت سے تو میں کہتا نہیں، ہاں آپ کے دوست کو صاحب عالم مرزا ان..... فتح الملک بہادر[1] سے ملا دیتا ہوں انکو آجکل مشاعرہ کی لو لگی ہوئی ہے، حضور سے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکے ہیں مگر وہ ٹال گئے اگر ان صاحب نے ذرا بھی زور دیا تو مجھے یقین ہے کہ صاحب عالم کہہ سنکر ضرور اجازت حاصل کرلیں گے۔ اچھا تو مولوی صاحب کل آپ ایک بجے قلعہ معلیٰ میں آجائیے میں

---

[1] ان کا نام مرزا فخرالدین، خطاب مرزا فتح الملک شاہ بہادر عرف مرزا فخرو اور تخلص رمز تھا۔ بہادر شاہ ثانی کے منجھلے بیٹے تھے۔ مرزا محمد دارا بخت عرف مرزا شبو ولیعہد سلطنت کے انتقال کے بعد ۱۸۴۹ء میں ولی عہد ہوئے۔ مگر غدر سے پہلے ہی ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء میں ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کیا ان کے انتقال کے بعد مرزا جواں بخت کی ولیعہدی کے جھگڑے پڑے۔

چوبدار سے کہہ جاتا ہوں یہ اندر پہنچا دے گا۔ آگے آپ جانیں آپ کی قسمت۔" یہ کہہ کر حکیم صاحب نے خدا بخش کو آواز دی۔ وہ آیا تو اس سے کہا کہ "کل یہ صاحب حویلی[1] میں ایک بجے آئیں گے ان کو میری بیٹھک میں پہنچا دینا۔" یہ کہہ کر نواب صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور میں آداب کر کے واپس چلا آیا۔

دوسرے روز ایک بجے کے قریب میں مولویانہ ٹھاٹھ سے جبہ پہن، شملہ باندھ، قلعہ معلی پہنچا لاہوری دروازے کے باہر خدا بخش کھڑے ہوئے تھے وہ مجھ کو حکیم صاحب کی بیٹھک میں لے گئے۔ بیٹھک جس کو پہلے زمانہ میں "نشست" کہا جاتا تھا۔ دیوان عام سے ملی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے مجھے دیکھ کر بولے "اجی! مولوی صاحب میں نے آپ کا کام کر دیا ہے، صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر سے صبح ہی کو ملنا ہو گیا۔ وہ اس تجویز سے بڑے خوش ہوئے، فرماتے تھے، جہاں پناہ سے میں اجازت لئے لیتا ہوں۔ مگر مشاعرہ کا انتظام ایسا ہونا چاہیئے کہ ہم لوگ بھی آ سکیں خیر بیٹھیئے شاید ابھی آپ کی یاد ہو۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ چوبدار نے آ کر کہا "وہ کریم الدین صاحب کون ہیں۔ ان کو حضور والا یاد فرماتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے میں سمجھا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے پاس جا کر معاملہ طے ہو جائے گا یہ کیا خبر تھی کہ بارگاہ جہاں پناہی میں یاد ہو گی۔ اور یاد بھی ایسے وقت کہ میرا سانس بھی پیٹ میں پوری طرح نہ سمایا ہو گا" حکم حاکم مرگ مفاجات اٹھا اور چوبدار کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ تمام راستہ آیۃ الکرسی پڑھتا رہا۔ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ یہ بندہ خدا کدھر لئے جا رہا ہے اندر سے قلعہ دیکھنے کا مدت سے شوق تھا۔ اب جو موقع ملا تو.... کن انکھیوں سے بھی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چلتے چلتے اندر آ گئے۔ آخر خدا خدا کر کے

---

[1] قلعہ دہلی کو لال حویلی یا صرف حویلی بھی کہا جاتا ہے حافظ عبدالرحمن خاں احسان کا شعر ہے کہ:۔ میری تنخواہ لوٹی ان لیٹروں نے حویلی میں :: بہادر شاہ غازی کی دہائی ہے دہائی ہے

چوبدار نے دیوان خاص کی سیڑھیوں کے پاس لیجا کھڑا کر دیا۔ اور آپ اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ حضرت جہاں پناہ اس وقت حمّام میں رونق افروز تھے۔ جن صاحبوں نے دہلی کا قلعہ نہیں دیکھا ہے وہ شاید نہ سمجھ سکیں کہ گرمیوں میں حمام میں بیٹھنے کے کیا معنی۔ اصل یہ ہے کہ یہ حمام کیا ہے۔ ایک عالیشان عمارت ہے وہ گرم ہے اور جو جمنا کے رُخ پر ہے وہ سرد ہے، ریتی کے رخ خس کے پردے ڈال کر خس خانہ بنا لیا جاتا ہے اندر نہر بہتی ہے۔ بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں ان میں فوارے چلتے ہیں حمام کیا ہے ایک بہشت کا نمونہ ٹکڑا ہے۔ چوبدار جو گیا تو آنے کا نام نہیں لیتا دھوپ میں کھڑے کھڑے فشار ہو گیا پسینہ میں تربتر گردن نیچی کئے کھڑا ہوں اور ناک سے پسینہ کی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی ہیں۔ ارادہ ہوا کہ واپس چلا جاؤں۔ اول تو طلبی کے بعد بھاگ جانا ہی نازیبا، دوسرے راستہ کس کو معلوم خدا خدا کر کے یہ مشکل آسان ہوئی چوبدار نے آکر کہا کہ "چلیئے" اس ایک لفظ نے خود بخود پاؤں میں لغزش اور دل میں کپکپی پیدا کر دی۔ خیر کسی نہ کسی طرح الٹے سیدھے پاؤں ڈالتا حمام میں داخل ہو گیا۔ چوبدار نے آواز دی "ادب سے" "نگاہ روبرو، حضرت جہاں پناہ سلامت آداب بجالاؤ"۔ میں نواب زین العابدین خاں صاحب سے یہ سبق پورا اور اچھی طرح پڑھ کر آیا تھا دہرا ہو کر سات تسلیمات بجالایا۔ اور نذر گزرانی، نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اٹھی ہوئی تو وہاں کا رنگ دیکھا۔ حضرت پیر و مرشد ایک چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے پائتی مرزا فخرو بیٹھے پاؤں دبا رہے تھے۔ دہلی میں وہ کون ہے جس نے حضرت ظل اللہ کو نہیں دیکھا، میانہ قد، بہت نحیف جسم، کسی قدر لمبا چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں بہت ابھری ہوئی، لمبی گردن۔ چوکا ذرا اونچا۔ پتلی ستواں ناک، بڑا دہانہ گہری سانولی رنگت۔ سر منڈا ہوا۔ چھدری داڑھی، گلوں پر بہت کم ٹھوڑی پر زیادہ بال نہیں کتری ہوئی۔ ۸۰ برس سے اونچی عمر تھی۔ بال سفید بھگ ہو گئے تھے، لیکن پھر بھی داڑھی میں

اکا دکا سیاہ بال تھا۔ چہرہ پر جھرّیاں تھیں لیکن باوجود پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں وہی کراراپن تھا۔ سبز کمخواب کا ایک برکا پیجامہ اور سفید ڈھاکہ کی ململ کا کرتہ زیب تن تھا۔ سامنے ایک چوکی پر جامہ وار کی خفتان اور کارچوبی چوگوشیہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی اب رہے مرزا فخرو تو وہ عین مین باپ کی تصویر تھے، ۳۲، ۳۳ برس کی عمر تھی۔ فرق تھا تو بس یہی کہ وہ بڈھے تھے۔ یہ جوان ان کا رنگ بڑھاپے کی وجہ سے ذرا کلونس لے آیا تھا۔ ان کا کھلا گیہواں رنگ تھا۔ ان کی داڑھی سفید تھی۔ ان کی سیاہ ورنہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بادشاہ لیٹے ہیں اور ایک بیٹھے ہیں، دونوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ اور بادشاہ سلامت نے فرمایا "اماں[1]۔ تمہارا ہی نام کریم الدین ہے تم کہیں باہر کے رہنے والے معلوم ہوتے ہو" میں نے کہا کہ خانہ زاد پانی پت کا رہنے والا ہے بچپن ہی سے حضرت ظل اللہ کے سایہ عاطفت میں آرہا ہے" فرمایا" اماں! ابھی تمہارا ہی تذکرہ مرزا فخرو کر رہے تھے، میرا خود جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح دیوان عام میں مشاعرہ کروں مگر کیا کروں زمانہ کی ہوا ایسی بگڑ گئی ہے کہ مناسب معلوم نہیں ہوتا یہ صحیح ہے۔ کہ "بود ہم پیشہ باہم پیشہ دشمن" لیکن خدا محفوظ رکھے۔

---

[1] قلعہ دہلی کے آخری دور میں شاہان دہلی بعض وقت مرد و عورت دونوں کو "اماں" سے خطاب کیا کرتے تھے۔ اس پرانے طرز کی جھلک حیدرآباد کی روزمرہ میں بھی کسی قدر نظر آتی ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہے کہ ایک مؤرخ نے اس طریقہ مخاطبت کی بنا پر قلعہ معلی کی تہذیب و اخلاق پر حملہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ بادشاہ کے اخلاق کی پستی کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بھی "اماں" کہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے یہ صاحب انگریزی نہیں جانتے تھے ورنہ ان کو یہ پڑھ کر تعجب ہوتا کہ جس قوم کو وہ تہذیب کا پتلا اور اخلاق کا نمونہ ظاہر کرتے ہیں ان کے ہاں بھی خاوند اپنی بیوی کو "اماں" کہتا ہے اور بیوی خاوند کو کبھی "ابا" کبھی "دادا" پکارتی ہے۔ میرے خیال میں یہ "ارے میاں" کا اختصار ہے چنانچہ اب بھی بے تکلف بول چال میں میاں کو ماں ہی کہے جاتے ہیں (ڈاڈیٹر)

ایسی دشمنی بھی کس کام کی کہ دو گھڑی مل جل کر نہ بیٹھنے دے۔ دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ وہ کچھ دنوں ٹھیک چلا، پھر میں نے دیکھا کہ بے لطفی بڑھ رہی ہے اس لئے بند کر دیا۔ منشی فیض پارسا نے اجمیری دروازے کے باہر غازی الدین خاں کے مدرسہ میں مشاعرہ شروع کیا۔ وہ تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔ وہ تو کہو غنیمت ہوا کہ ردیف میں "تیلیاں" ہی تھیں، کہیں خدانخواستہ اگر ردیف "لکڑیاں" ہوتیں تو خدا معلوم کتنوں کے سر پھوٹ جاتے تم مشاعرہ تو کر رہے ہو مگر ان ہاتھیوں کی ٹکر کیسے سنبھالو گے، استاد ذوق تو بیچارے بے زبان آدمی ہیں، مگر خدا بچائے حافظ ویران سے وہ ضرور لڑمریں گے۔ اور تم جانتے ہو "اندھے کی داد نہ فریاد اندھا مار بیٹھے گا" کی صورت ہے۔ کسی نے اگر مشاعرہ میں استاد پر ذرا بھی چوٹ کر دی تو ان نابینا صاحب کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ میاں تم سے یہ کام سنبھلتا نظر نہیں آتا"۔ میں نے عرض کی کہ "قبلہ عالم میری کیا ہمّت ہے جو میں اتنے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکوں، مشاعرہ کا سارا انتظام نواب زین العابدین خاں عارف نے اپنے ذمّہ لیا ہے۔ فرمایا، تو مجھے اطمینان ہے یہ لڑکا بڑا ہوشیار اور ذہین ہے مرزا نوشہ اور مومن خاں وہ سنبھال لیگا۔ رہے استاد ذوق ان سے میں کہہ دونگا۔ خدا نے چاہا تو اس طرح مشاعرہ چل جائیگا۔ مگر میں یہ کہے دیتا ہوں کہ مشاعرے سے پہلے ان لوگوں سے مل لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت پر انکار کر بیٹھیں، میں اور میرا شبو تو آ نہیں سکتے ہیں۔ ہاں مرزا فخرو کو اپنی جگہ بھیج دونگا اور انشاء اللہ اپنی غزل بھی بھیجونگا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم نے "طرح" کیا رکھی ہے "طرح" ہی تو بڑے جھگڑے کی چیز ہے، یہ ذرا سوچ سمجھ کر دینا یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ باذو سے آواز آئی "اے ہے یہ انا بچہ کو کیا بے طرح سلا گئی ہے"۔ یہ سنتے ہی بادشاہ سلامت نے فرمایا "لو بھائی یہ خود بخود فال گوش مل گئی۔ تم اس مشاعرہ میں کوئی "طرح" ہی نہ دو۔ جس شخص کا جس بحر میں جس ردیف قافیہ میں

غزلیں پڑھنے کو دل چاہے پڑھے" "نہ لینا ایک نہ دینا دو" میں نے عرض کی پیر و مرشد تاریخ- فرمایا ۱۴ر رجب مقرر کر دو دن بھی اچھا ہے، چاندنی رات بھی ہوگی- آج پانچ ہے- نو دن باقی ہیں- اتنے دنوں میں بہت انتظام ہو سکتا ہے- انگریزی کی ۲۰ر جولائی پڑے گی موسم بھی ٹھنڈا ہو جائیگا- اچھا اب خدا حافظ میں نے عمر و دولت و اقبال کی دعا دی- اور خوش خوش الٹے قدموں واپس ہوا مرزا فخرو بیچ میں کچھ نہ بولے- مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کیا دھرا انہیں کا ہے ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ خلوت شاہی- سچ ہے" بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے" یہاں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے لئے حضوری اتنی مشکل نہ تھی- جتنا رخصت ہو کر یہ الٹے پاؤں چلنا ہوا- زمین پاؤں کو نہیں لگی تھی اس لئے دو چار قدم ہی چلا ہونگا کہ پیچھے ایک دیوار سے ٹکرایا- اس ٹکر سے ذرا سنبھلا تھا کہ نہر میں پاؤں جا پڑا بہزار مشکل اس جادہ ادب کو طے کر کے باہر نکل ہی آیا- ادھر میں نکلا ادھر چوبدار ساتھ ہوا- اس کو انعام دے دلا کر ٹالا- حکیم صاحب کے پاس آیا وہ میرے انتظار ہی میں بیٹھے تھے- ان سے تمام واقعہ بیان کیا- فرمانے لگے" مولوی صاحب بات یہ ہے کہ مرزا فخرو بہت دنوں سے مشاعرے کے لئے بیچین ہو رہے تھے- ان ہی کی یہ کار گزاری ہے- ورنہ بھلا یہ معاملہ اس طرح تھوڑا طے ہوتا- مگر چلو، تمہارا کام بن گیا- میاں عارف سے بھی جا کر کہہ دو- وہ میرے ہی ہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہونگے-

حکیم صاحب کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ واقعی نواب صاحب میرے انتظار میں بیٹھے ہیں- ان سے حالات بیان کئے کہنے لگے چلو یہ مشکل تو آسان ہوئی اب تم یہ کرو کہ کل کم سے کم استاد ذوق، مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے مکان کا گشت لگا ڈالو، مگر دیکھنا ذرا پھونک پھونک کر قدم رکھنا- یہ تینوں بڑے دماغ دار آدمی ہیں اگر ذرا بھی تم سے بات چیت میں لغزش ہوئی تو یاد رکھو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا- جب دیکھو کہ ان میں کوئی ہاتھوں سے نکلا ہی جاتا ہے تو میرا نام لے دینا کیا عجب ہے کہ میرا نام سن کر راضی ہو جائیں دوسری بات یہ ہے کہ مبارک النساء بیگم کی حویلی جس میں تمہارا مطبع ہے دور دور میں

خالی کر کے بالکل میرے حوالے کردو۔ مجھے وہاں نشست کا انتظام کرنا ہوگا۔" میں نے عرض کی اور میں کہاں جاؤں؟" فرمانے لگے میرے مکان میں آٹھ نوروز کے لئے آجاؤ تم کو تکلیف تو ہوگی۔ مگر کیا کیا جائے۔ جب قلعہ کے لوگوں کو بلا رہے ہیں تو انہیں کے رتبہ کے موافق مکان کو بھی درست کرنا ہوگا۔ دیکھئے خرچ کیا پڑتا ہے۔" میں نے کہا مشاعرہ میں خرچ ہی ایسا کون سا ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ سوا سو روپے اٹھ جائیں گے۔ یہ سن کر نواب صاحب مسکرائے اور کہا "میاں کریم الدین تم کیا جانو کہ ایسے مشاعروں میں کیا خرچ ہو جاتا ہے ہزار دو ہزار میں بھی اگر پوتھ پورا ہوگیا تو سمجھو کہ سستے چھوٹے۔" یہ سن کر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں نے کہا نواب صاحب اگر یہ صورت ہے تو میرا ایسے مشاعرے کو دور ہی سے سلام ہے مطبع تو مطبع اگر اپنے آپ کو بیچ ڈالوں تو اتنی رقم نہ اٹھے فرمانے لگے" بھئی تم اس خرچ کے جھگڑے میں نہ پڑو۔ خدا یہ مشکل بھی آسان کر دے گا۔ جب میں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے تو میں جانوں اور میرا کام جانے۔ تم بیٹھے تماشہ دیکھو مگر ہاں مکان کل تک خالی کر دینا۔ نو ہی دن تو رہ گئے ہیں، رات کم اور سوانگ بہت ہے اب جاؤ خدا حافظ۔ تم تھک بھی گئے ہو ذرا آرام لے لو اور کل صبح ہی سے ادھر مکان خالی کرنے کی فکر کرو۔ ادھر ان تینوں استادوں کے مکان کا چکر لگاؤ۔ مکان خالی ہو جائے تو فوراً ہی مجھے اطلاع دینا۔ اور خود میرے ہاں چلے آنا اس میں شرم کی کون سی بات ہے آخر میری ہی وجہ سے تو تم اپنا مکان چھوڑ رہے ہو۔" وہاں سے نکل کر میں اپنے گھر آیا۔ مطبع کو بند کرتے کرتے اور سامان کو سمیٹتے سمیٹتے شام ہوگئی۔ صبح اٹھ کر اپنے پہننے، اوڑھنے کا سامان تو نواب زین العابدین خاں کے مکان پر روانہ کیا اور خود کابلی دروازہ کی طرف چلا کہ پہلے استاد ذوقؔ ہی سے بسم اللہ کروں۔

کابلی دروازہ کے پاس ہی انکا مکان ہے۔ بہت چھوٹا ہے، چھوٹی سی ڈیوڑھی ہے۔ اس میں ایک طرف جائے ضرور ہے۔ اندر صحن اتنا چھوٹا کہ دو پلنگ بچھنے کے بعد راستہ چلنے کیلئے

مشکل سے جگہ رہتی ہے۔ سامنے چھوٹا سا دالان ہے اور اس کے اوپر ایک کمرہ۔ صحن میں سے زنانہ مکان میں راستہ جاتا ہے۔ جب میں پہنچا تو استاد صحن میں بان کی کھرّی چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے، دوسری چارپائی پر ان کے چہیتے شاگرد حافظ غلام رسول ویران بیٹھے تھے۔ یہ اندھے ہیں اور انہی سے ہوشیار رہنے کیلئے حضرت جہاں نے ارشاد فرمایا تھا۔ استاد ذوق قدوقامت میں متوسط اندام ہیں، رنگ اچھا سانولا ہے، چہرہ پر چیچک کے بہت داغ ہیں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز ہیں۔ چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا ہے اس وقت سفید تنگ پاپجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے ہوئے تھے سر پر ململ کی ٹوپی گول چندوے کی تھی۔ میرا صحن میں قدم رکھنا تھا کہ پاؤں کی آہٹ سنتے ہی حافظ ویران نے چونک کر کہا "کون ہے؟" میں نے کہا "کریم الدین" "استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔" استاد نے اپنا نام سنکر کہا "آیئے آیئے اندر تشریف لایئے" میں نے آداب کیا، انہوں نے فرمایا، "بیٹھو بھئی بیٹھو" میں حافظ ویران کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہا "فرمایئے کیسے تشریف لانا ہوا۔" میں نے عرض کیا کہ میرا ارادہ قاضی کے حوض پر ایک مشاعرہ شروع کرنے کا ہے۔ پہلا رجب تاریخ مقرر ہوئی ہے اگر حضور بھی از راہ ذرہ نوازی قدم رنجہ فرمائیں تو بعید از کرم ہوگا" میرا اتنا کہنا تھا کہ حافظ ویران تو چراغ پا ہو گئے کہنے لگے۔ جایئے جایئے۔ کہاں کا مشاعرہ نکالا ہے استاد کو فرصت نہیں ہے۔ ان مرزائے پالک[1] کے پاس کیوں نہیں جاتے جو خواہ مخواہ ان کو آکر دق کرتے ہو استاد نے کہا بھئی ویران۔ تمہاری زبان نہیں رکتی۔ بیٹھے بٹھائے تم دنیا بھر سے

---

[1] ان دنوں دہلی میں لوگوں نے یہ اڑا رکھا تھا کہ مرزا نوشہ (غالب) مرزا عبداللہ بیگ کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ انہوں نے ان کو پال لیا ہے اور یہ دراصل کسی کشمیری کی اولاد ہیں۔ حافظ ویران نے اس طرف اشارہ کیا ہے خدا محفوظ رکھے دہلی والوں سے جو باہر سے آیا اس کے حسب ونسب میں انہوں نے کیڑے ڈالے، استاد ذوق کو شہر بھر نائی کہتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ آزاد مرحوم نے ان کے ہاتھ میں استرے کی بجائے تلوار دیکران کو سپاہی زادہ بنا دیا ہے۔

لڑائی مول لیتے ہو۔ حافظ ویران کہنے لگے۔ استاد جب وہ آپ کو برا بھلا کہیں تو ہم کیوں چپ بیٹھنے لگے۔ وہ ایک کہیں گے تو ہم سو سنائیں گے۔ اور تو اور میاں آشفتہ کو دن لگے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے کہ آپ کو ناؤڑا کہہ رہے تھے۔ مگر میں نے بھی ایسی خبر لی کہ تمام عمر یاد کرینگے ان کی سات پشت کو تُوم ڈالا۔ استاد فرماتے لگے تابھئی نا، تم میری وجہ سے کیوں بلا میں پڑتے ہو۔ مجھے جس کا جو بھی جی چاہے کہے میں نے ان سب کا جواب ایک رباعی میں دیدیا ہے؛

ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے ۔۔۔ تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ
کیوں برا کہنے سے اس کے تو بُرا مانتا ہے ۔۔۔ اور جو خود ہی تو برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے

میں نے عرض کی کہ میں کل بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا تھا حضرت ظل اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس مشاعرہ میں ہم مرزا فتح الملک بہادر کو اپنی طرف سے بھیجیں گے اور اپنی غزل بھی بھیجکر مشاعرے کی عزت بڑھائیں گے۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ استاد ذوقؔ سے بھی کہدیں گے وہ بھی مشاعرے میں ضرور آئیں گے۔ یہ سنکر حافظ ویران تو ٹھنڈے پڑ گئے استاد نے فرمایا ہاں بھئی مجھے یاد آ گیا کل شام کو حضرت پیر و مرشد نے مجھ سے بھی فرمایا تھا اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ تو بھی ضرور جائیو۔ میاں میں انشاء اللہ تعالیٰ ضرور آؤنگا۔ مگر یہ تو بتاؤ "طرح" کیا رکھی ہے، میں نے عرض کیا اور کہا کہ حضرت ظل سبحانی نے "طرح" کا جھگڑا ہی نکالدیا ہو شخص جس بحر اور جس ردیف قافیہ میں چاہے آکر غزل پڑھے استاد تو "بہت خوب بہت خوب" کہتے رہے مگر حافظ ویران کی تیوری کے بل نہیں گئے۔ برابر بڑبڑاتے رہے کہ اللہ خیر کرے، دیکھیے اس مشاعرہ کا حشر کیا ہوتا ہے، حضرت پیر و مرشد بھی بیٹھے بیٹھے شتلے[1] چھوڑا کرتے ہیں، وہ اپنی کہے گئے۔ میں تو اٹھ سلام کر چلا آیا۔

دوسرا حملہ اسد اللہ خاں غالبؔ پر تھا۔ چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بلی ماروں میں آیا حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے قاسم جان کی گلی گئی ہے، بائیں طرف پہلا ہی

[1] معلوم نہیں کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے مگر دہلی میں عام طور پر "شگوفے" کے معنی میں استعمال کرتے ہیں

مکان ان کا تھا۔ یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے، اس کے دو دروازے ہیں ایک مردانہ دوسرا زنانہ، محل سرا کا ایک راستہ مردانہ مکان میں سے بھی ہے باہر کے دروازے کی دہلیز ذرا دھنسی ہوئی سی ہے۔ دروازے کے اوپر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھڑیاں گرمی میں مرزا صاحب دوپہر کے وقت اسی کوٹھڑی میں رہا کرتے ہیں۔ دروازے سے گزر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان، جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاؤ تکئے سے لگے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

مرزا نوشہ کی عمر کوئی ۵۰ سال کی ہوگی، حسین اور خوشرو آدمی ہیں، قد او نچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا۔ موٹا نقشہ اور سرخ و سفید رنگ ہے۔ لیکن اسمیں کچھ کچھ زردی جھلکتی ہے ایسے رنگ کو محاورے میں چمپئی کہا جاتا ہے۔ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ہیں، داڑھی بھری ہوئی ہے، مگر گھنی نہیں ہے۔ سر منڈا ہوا اس پر لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کلاخ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے۔ ایک برکا سفید پائجامہ، سفید ململ کا انگرکھا، اس پر ہلکے زرد زمین کی جامہ وار چغہ[1]۔ میری آہٹ پا کر لکھتے لکھتے آنکھ اونچی کی۔ میں نے آداب کیا سلام کا جواب دیا اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں آگئے۔ یہ امین الدین خاں صاحب نواب لوہارو کے بھائی ہیں۔ ریختے میں رخشاں اور فارسی میں نیر تخلص کرتے ہیں کوئی چالیس سال کی عمر ہے۔ انشاء پردازی، جغرافیہ تاریخ، علم الانساب، اسمائے رجال، تحقیق لغات اور واقعیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے مرزا نوشہ کے خلیفہ ہیں۔ چھوٹا قد، بہت گورا رنگ، نازک نازک نقشہ، خلاقی آنکھیں، ملگی داڑھی، چھریرا بدن، غرض نہایت خوبصورت آدمی ہیں۔ ایک برکا سفید پیجامہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے تھے قالب چڑھی ہوئی چو گوشیہ ٹوپی سر پر تھی۔ ایک بڑا رومال سموسہ بنا کر شانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا۔ انھوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور خاموش ایک طرف دوزانو

---

[1] قلعہ دہلی کے عجائب خانہ میں مرزا غالب کی ایک تصویر ہے، اس سے یہ لباس لیا گیا ہے۔

نہایت ادب سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں مرزا غالب بھی لکھنے سے فارغ ہوئے، پہلے نواب صاف کی طرف مڑے اور کہنے لگے۔ میاں نیرؔ تم کس وقت آ بیٹھے۔ بھئی اس مرزا تفتہ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ہر ہفتہ آٹھ دس غزلیں اصلاح کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ اصلاح دیتے دیتے تھک جاتا ہوں۔ میری طرف دیکھ کر کہا آپ شاید مولوی کریم الدین صاحب ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں، فرمانے لگے۔ حضرت آپ کے تشریف لانے کا مقصد مجھے پہلے ہی سے معلوم ہو گیا تھا۔ کل ہی میاں عارف آکر مجھ سے آپ کے مشاعرے میں چلنے کا وعدہ لے گئے ہیں۔ کہو میاں نیرؔ تم بھی چلو گے نواب صاحب نے کہا۔ جہاں آپ وہاں میں۔ آپ تشریف لے جائیں گے تو انشاء اللہ میں بھی ضرور ہمراہ ہونگا۔ مرزا صاحب نے پوچھا۔ مگر بھئی اب تک علائی نہیں آئے۔ مجھ کو ان کا کل سے انتظار ہے اے لو، وہ آ ہی گئے۔ بھئی بڑی عمر ہے ابھی میں تم کو پوچھ رہا تھا۔

نواب علاء الدین خاں، علائی نواب لوہارو کے ولی عہد ہیں۔ کوئی ۲۳، ۲۴ سال کی عمر ہے، متوسط قد، گندمی رنگ، موٹا موٹا نقشہ، گول چہرہ، شربتی آنکھیں اور گھنی چڑھی ہوئی داڑھی ہے۔ لباس میں غلطے کا تنگ مہری کا پاجامہ، سفید جامدانی کا انگرکھا اس پر سینہ کھلی ہوئی سیاہ مخمل کی نیم آستین اور سر پر سیاہ ہی مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی تھی۔ وہ بھی آداب کر کے ایک طرف بیٹھ گئے، اور کہا واقعی آج دیر ہو گئی۔ مجھے خود خیال تھا کہ آپ انتظار کر رہے ہوں گے، میری طرف دیکھ کر کہا آپ کی تعریف۔ مرزا نوشہ نے تمام قصہ بیان کیا اور کہا، علائی۔ تم کو بھی چلنا ہو گا۔ ابھی تو شاید تم لوہارو نہیں جا رہے ہو۔ انہوں نے کہا۔ "بہت خوب آپ تشریف لے جائیں گے تو میں بھی حاضر ہوں۔ جب یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تو میں نے اجازت چاہی۔ وہاں سے رخصت ہو کر نواب زین العابدین خاں کے مکان میں آیا انہوں نے مردانے کا ایک حصہ میرے لئے خالی کر دیا تھا۔ جو اسباب صبح میں نے بھیجا تھا اسکو جا بجا پایا۔ کپڑے اتارے اندر سے کھانا آیا کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو رہا۔ چار بجے کے قریب

اٹھ کر حکیم مومن خاں کے ہاں جانے کی تیاری کی۔

حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچے میں ہے۔ راستہ میں مولوی امام بخش صاحب صہبائی مل گئے۔ یہ کالج میں میرے استاد رہے ہیں کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے منھ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں۔ سر پر پٹے ہیں۔ بڑے دبلے پتلے آدمی ہیں کوئی چالیس سال کی عمر ہوگی۔ ایک برکا سفید پجامہ، سفید انگرکھا کشمیری کام کا جبہ، پہنتے اور سر پر چھوٹا صافہ باندھتے ہیں۔ یہ بھی چیلوں کے کوچے میں رہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہاں جاتے ہو، میں نے کہا حکیم مومن خاں کے پاس۔ پوچھا کیا کام ہے میں نے حال بیان کیا۔ کہنے لگے چلو میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ حکیم آغا جان کے چھتے کے سامنے خاں صاحب کا مکان ہے۔ بڑا دروازہ ہے۔ اندر بہت وسیع صحن اور اس کے چاروں طرف عمارت ہے دو طرف دو صحنچیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان۔ پچھلے دالان کے اوپر کمرہ ہے سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا ہے۔ لیکن منڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے[۱]۔ دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے۔ اندر کے دالان میں بیچوں بیچ قالین پر گاؤ تکیہ سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں سامنے حکیم سکھانند المتخلص رقم اور مرزا رحیم الدین حیا مودب دو زانوں بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً ۴۸ سال کی تھی، کشیدہ قامت تھے سرخ و سفید رنگ تھا۔ جس میں سبزی جھلکتی تھی، بڑی بڑی روشن آنکھیں لمبی لمبی پلکیں کھنچی ہوئی بھویں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، ان پر پان کا لاکھا جما ہوا مسی آورد[۵]

---

[۱] میں نے خود یہ مکان ۲۰، ۲۲ برس ہوئے دیکھا تھا۔ ٹوٹ کر کھنڈر ہو گیا تھا۔ تین طرف کی عمارت گر گئی تھی سامنے کا حصہ قائم تھا، معلوم نہیں کہ اوپر کی منڈیر کیوں اتنی نیچی رکھی گئی تھی۔ اسی منڈیر سے ٹھوکر کھا کر حکیم مومن خاں نیچے گرے ہاتھ اور بازو ٹوٹ گیا اور اسی وجہ سے ان کا انتقال ہوا خود ہی مرنے کی تاریخ کہی تھی "دست و بازو بشکست"

دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے بازو، پتلی کمر، چوڑا سینہ، لمبی لمبی انگلیاں، سر پر گھونگھر والے لمبے لمبے بال زلفیں بن کر پشت اور شانوں پر بکھرے، ہیں کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی ہیں۔ کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔ بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا۔ لیکن اس کے نیچے کرتہ نہ تھا۔ اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں سرے سامنے پڑے ہوئے تھے، ہاتھ میں پتلا سا خار پشت پاؤں میں سرخ گلبدنی کا پیجامہ، پھر یوں پر سے تنگ اور اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا، کبھی کبھی ایک برکا پیجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا چوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئی کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی الٹا کر چڑھا لیتے تھے، سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی۔ اس کے کنارے پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آگئی تھی اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔ غرض یہ کہ نہایت خوش پاک اور جامہ زیب آدمی تھے جب میں اور مولوی صہبائی دونوں پہنچے تو حکیم صاحب مرزا رحیم الدین حیا سے کہہ رہے تھے کہ صاحب عالم تمہارے شطرنج کے نقشوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ایک ہو دو ہوں آخر یہ روز روز کی فرمائشیں کوئی کہاں تک پوری کرے۔ صاحب عالم نے کہا، استاد کیا کروں ریزیڈنٹ بہادر کے پاس ولایت سے شطرنج کے نقشے حل کرنے کو آیا کرتے ہیں۔ کچھ تو میں خود حل کر کے ان کے پاس بھیجدیتا ہوں جو سمجھ میں نہیں آتے وہ آپ کے پاس لے آتا ہوں حکیم صاحب نے نظر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہمارا اسلام لیکر کہا بیٹھیے بیٹھیے، ہم بیٹھ گئے اور وہ پھر صاحب عالم کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ میاں حیا! جو نقشہ تم لائے ہو وہ تو میرے خیال میں کچھ پیچیدہ نہیں ہے، تم کہتے ہو کہ سرخ مہروں کو مات ہو گی، میں کہتا ہوں نہیں

سبز کو ہو گی، تم بساط بچھاؤ میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں اچھا پہلے ذرا مولوی صہبائی سے بات کر لوں اور میاں سکھانند تم بیٹھے انتظار کرتے رہو میں حکم لگا چکا ہوں کہ جب تک پیوز کی طرف سے اس چھپکلی کا جوڑا نہ آجائے یہ سامنے کی دیوار سے نہ جائے گی۔ اس کا جوڑا آئے پر آئے۔ سکھانند حکیم تھے رقم تخلص کرتے تھے۔ دھرم پورہ میں رہتے تھے۔ کوئی چالیس سال کی عمر تھی۔ ریختے میں شاہ نصیر کے اور رمل میں خاں صاحب کے شاگرد تھے بڑے خوش پوشاک، خوش وضع، خوش اخلاق، ظریف الطبع، حلیم، خوبصورت اور شکیل آدمی تھے استاد کا ایسا ادب کرتے تھے، جیسے کوئی بیٹا باپ کا کرتا ہے۔ حکیم صاحب کی باتیں سن کر بہت خوب بہت مناسب کہتے رہے ان سے گفتگو کر کے حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے ارے بھئی صہبائی تم تو کئی دن سے نہیں آئے کہو خیریت تو ہے اور آپ کے ساتھ یہ صاحب کون ہیں۔ مولوی صہبائی نے کہا یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے اب مطبع کھول لیا ہے، وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں۔ حکیم صاحب نے ہنس کر کہا بس صاحب مجھے تو معاف ہی کیجئے، اب دلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے۔ ایک صاحب ہیں وہ اپنی امت کو لیکر چڑھ آتے ہیں[1] شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں۔ مفت میں واہ واہ، سبحان اللہ سبحان اللہ کا غل مچا کر طبیعت کو منغص کر دیتے ہیں، یہ نہیں سمجھتے کہ ؎

صائب دو چیز می شکند قدر شعرا  تحسین نا آشناس و سکوت سخن شناس

دوسرے صاحب ہیں وہ ہڑ ہڑ کو ساتھ لئے پھرتے ہیں اور خواہ مخواہ استادوں پر حملہ کراتے ہیں خود تو میدان میں آتے نہیں اپنے نااہل پٹھوں کو مقابلے میں لاتے ہیں اس روز جو اس جانور نے یہ شعر پڑھ کر کہ

مرکز محور گردوں بہ لب آب نہیں!  ناخن قوس قزح شبہ مضراب نہیں

کہا یہ کہ غالب کے رنگ میں لکھا ہے تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ کو کس قدر ناگوار گزرا

[1] یہ استاد ذوق اور شہزادوں کی طرف اشارہ تھا۔

غالب کے رنگ میں شعر کہنا تو کجا وہ یا ان کے استاد پہلے مرزا نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں اب رہے میر صاحب[1] تو ان کی بات دوسری ہے۔ یہ بھی واہیات بکتے ہیں، اگر کسی پر حملہ تو نہیں کرتے، بلکہ ان کی وجہ سے مشاعرہ میں کچھ چہل پہل ہو جاتی ہے لیکن میں نے تو اسی وجہ سے مشاعروں میں جانا ہی ترک کر دیا ہے۔ میں نے عرض کی کہ اس مشاعرے میں استاد ذوق اور مرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے حضرت ظل سبحانی کی غزل بھی آئے گی فرمایا ہر شخص مختار ہے چاہے خود آئے چاہے غزل بھیجے۔ میں تو نہ آؤں گا نہ غزل بھیجونگا یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک سوداگر کپڑوں کے دو گھٹے لیکر آیا۔ شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر آتا تو حکیم صاحب کے پاس اسکا آنا لازمی تھا۔ ریشمی کپڑوں سے ان کو عشق تھا۔ کوئی پسند آتا تو پھر قیمت کی پروا نہیں کرتے تھے، جو مانگتا دیتے۔ اس سوداگر نے ایک گٹھڑی مزدور کے سر پر سے اتاری۔ اس میں سے پٹ ایک چھپکلی نیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ گئی۔ جو چھپکلی پہلے سے دیوار پر جمی بیٹھی تھی وہ لپک کر اس سے آملی اور دونوں مل کر ایک طرف چلے گئے[2] ہم لوگ بیٹھے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ جب دونوں چھپکلیاں چلی گئیں۔ تو حکیم صاحب نے مسکرا کر آنند صاحب سے کہا۔ کہو میاں رقم تم نے دیکھا۔ انھوں نے کہا جی ہاں ایک خانے کے حساب لگانے میں مجھ سے غلطی ہوئی میں نے جو اپنی رائے پر اصرار کیا تھا اس کی معافی چاہتا ہوں۔ کہنے لگے اس کا خیال نہ کرو انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے، ہاں تو میاں صہبائی مشاعرے کے متعلق ہمارا تو صاف جواب ہے۔ میں نے جب دیکھا کہ خاں صاحب ہاتھوں سے نکلے ہی جا رہے ہیں تو مجھے نواب زین العابدین خاں کا آخری نسخہ یاد آیا میں نے کہا مجھے تو اس مشاعرے سے برائے نام تعلق ہے سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں عارف

---

[1] ان کا مفصل حال آگے آئے گا۔ یہ بھی عجیب رقم تھے۔

[2] یہ واقعہ ہے جس کے دیکھنے والے ایک صاحب کا ابھی کوئی بیس برس ہوئے انتقال ہوا ہے میں نے یہ واقعہ خود ان کی زبانی سنا ہے۔

کہا ہے وہ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور اب ان کو زندگی کی امید نہیں رہی، ان کی آخری خواہش ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لیں جس میں دہلی کے تمام کاملین فن جمع ہوں۔ وہ خود حاضر ہوتے، مگر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے ان کو کہیں آنے جانے سے منع کر دیا ہے۔ یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف بڑھا دیا۔ خاں صاحب بڑے غور سے میری بات سنتے رہے ہیں خاموش ہوا تو مولوی امام بخش صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ افسوس رہے۔ کیا خوش فکر اور ذہین شخص ہے یہ عمر اور یہ مایوسی۔ سچ ہے ہمیشہ سے نام اللہ کا، میری طرف سے عارف سے کہہ دینا کہ میاں میں ضرور آؤنگا، جب میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل گیا تو اور پاؤں پھیلائے اور کہا۔ نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مولوی صہبائی صاحب مفتی صدرالدین صاحب اور نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ کو بھی اپنے ہمراہ لائیے گا تو عنایت ہو گی۔ حکیم صاحب کہنے لگے۔ میاں صہبائی سے تو میں ابھی کہے دیتا ہوں اب رہے آزردہ اور شیفتہ تو واپس جاتے جاتے راستہ میں ان سے بھی کہتے جاؤ، کہہ دینا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے۔ ہاں تاریخ کیا مقرر کی ہے، مشاعرہ کہاں ہوگا اور طرح کیا ہے میں نے تاریخ بتا کر مکان کا پتہ دیا "طرح" کے متعلق حضرت جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو ہوئی تھی وہ بیان کی کہنے لگے ہمارے بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں، جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا جس میں "طرح" نہ دی گئی ہو خیر یہ تو اچھا ہوا کہ جھگڑے کا جھونپڑا ہی نہیں رہا۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ جب تک مقابلے کی صورت نہ ہو نہ شعر کہنے میں جی لگتا ہے اور نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے یہ کہہ کر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور میں سلام کر کے رخصت ہوا۔

چیلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدرالدین صاحب کا مکان تھا اس کے نزدیک ٹیا محل میں نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ رہتے ہیں مفتی صاحب کے ہاں جا کر معلوم ہوا کہ شیفتہ بھی مفتی صاحب ہی کے پاس بیٹھے ہیں میں نے کہا چلو اس سے بہتر

موقع ملنا محال ہے دونوں سے ایک ہی جگہ ملنا ہوگیا یہ سوچ کر اندر گیا۔ مکان کوٹھی کے نمونے کا ہے۔ انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا ہے صحن بہت بڑا نہیں ہے، اس میں مختصر سی نہر ہے۔ سامنے دالان در دالان ہے اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں۔ دالانوں سے ملا ہوا اونچا صحن چبوترہ ہے چبوترے کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے۔ ان پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ تختوں پر مفتی صاحب اور نواب صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مفتی صاحب کی عمر کوئی ۵۶، ۵۷ سال کی تھی، گداز جسم، سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئی ابھری ہوئی داڑھی بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی ہیں، ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں، بدن میں سفید ایک برکا پجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی عمامہ[1] تھا۔ جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں کے بعد دہلی میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ ہی کا نمبر تھا۔ ان کا رنگ گہرا سانولا تھا لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا اس پر نیچی سیاہ گول داڑھی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا لباس میں بھی زیادہ تکلف نہیں تھا۔ تنگ مہری کا سفید پجامہ، سفید کرتہ، نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبہ نما چگوشیہ ٹوپی پہنے ہوئے تھے تقریباً ۳۹، ۴۰ سال کی عمر ہے۔

میں آداب کر کے تخت کے ایک کونے پر دوزانوں بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب نے آنے کا سبب پوچھا

---

[1] پرانے زمانہ میں شرفا گھر پر بھی پورا لباس پہنے رہتے تھے، زنانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے۔ ورنہ سارا وقت مردانہ ہی میں گذرتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا۔ عالم ہوئے تو درس کا حلقہ ہوتا۔ شاعر ہوئے تو شعر کا چرچا رہتا غرض کوئی وقت بیکار نہ گزرتا خاص خاص دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوتی ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت لئے دیئے رہتے جہاں جاؤ یہ معلوم ہوتا کہ دربار لگا ہوا ہے، ہر شخص دوزانو مودب بیٹھا ہے، بے ضرورت نہ بات کی جاتی نہ جواب دیا جاتا ہے کوئی ہنسی کی بات ہوئی تو ذرا مسکرا دیئے کھلکھلا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ بڑھ کر بولنا یا اونچی آواز میں بولنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا

میں نے حکیم مومن خاں کا پیام پہنچا دیا۔ مفتی صاحب نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ ہیں خاں صاحب نے تو مشاعرے میں نہ جانے کا عہد کر لیا ہے، بھئی شفتہ! یہ کیا معاملہ ہے؟ یا تو خود نہیں جاتے تھے یا دوسروں کو بھی ساتھ گھسیٹ رہے ہیں۔ میں نے نواب زین العابدین خاں عارف کا واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے۔ ہاں یوں کہو، یہ بات ہے ورنہ مجھے تو یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ حکیم صاحب اور مشاعرے میں جائیں اچھا بھئی عارف سے کہدینا کہ میں اور شیفتہ دونوں آئیں گے یہاں سے چھٹی ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ گویا گنگا نہالیا۔ خوشی خوشی آکر نواب زین العابدین خاں سے واقعہ بیان کیا وہ بھی مطمئن ہو گئے میں نے حکیم مومن کا جب حال بیان کیا تو ان کے آنسو نکل آئے کہنے لگے۔ میاں کریم الدین تم کو بھی یہ معلوم ہے کہ میری حکیم صاحب سے صفائی نہیں ہے میں نے کہا نواب صاحب! آپ کیا فرماتے ہیں ان پر تو آپ کی بیماری سننے کا ایسا اثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا شاید ان کا سگا بھائی بھی بیمار ہوتا تو اتنا ہی اثر ہوتا۔ مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ انہوں نے مشاعروں میں نہ جانے کا عہد کر لیا تھا۔ صرف آپ کی وجہ سے انہوں نے یہ عہد توڑا ہے، نواب صاحب نے کہا۔ میاں تم کو ان لوگوں کی محبتوں کا کیا حال معلوم یہ لوگ وہ ہیں کہ اپنے دشمن کو بھی مصیبت میں نہ دیکھ سکتے، خیر اس کو جانے دو، حکم ہو تو میں بھی خدمت میں حاضر رہ کر مدد کروں۔ فرمایا نہیں بھئی نہیں۔ جہاں دو آدمیوں نے مل کر کسی کام میں ہاتھ ڈالا وہ خراب ہوا۔ تم اس انتظام کو بس مجھ پر ہی چھوڑ دو، بلکہ تم تو ادھر آنا بھی نہیں، تم نے اگر آکر میں میخ نکالی تو مجھ پر دہری تہری محنت پڑ جائے گی۔

## ۳۔ ترتیب

یہ شعر و سخن مجلس آراستند　　نشستند و گفتند و برخاستند

میں تاریخ ابو الفدار کے ترجمے میں ایسا گتھ گیا کہ ۷، ۸ روز تک گھر سے باہر ہی نہیں نکلا۔ نواب زین العابدین خاں کے شوق کی یہ حالت تھی کہ باوجود کمزوری و نقاہت کے روز صبح ہی سے جو باہر نکلتے تو کہیں رات کے آٹھ نو بجے گھر میں ان کی صورت دکھائی دیتی

اس لیے ان سے ملنا نہیں ہوا کہ کچھ حال پوچھتا بہرحال یہ آٹھ دن آنکھ بند کرتے گزر گئے اور مشاعرے کی تاریخ آہی گئی۔ ۱۴ رجب کو شام کے ساڑھے سات بجے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہوا۔ نواب صاحب کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو گئے ہیں تو اب تک واپس نہیں آئے گھر سے جو نکلا تو بازار میں بڑی چہل پہل دیکھی ہر شخص کی زبان پر مشاعرے کا ذکر تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ میاں کریم الدین کون ہیں، کوئی کہتا ہے کہ اس سے کیا، کوئی ہوں، مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ میں یہ باتیں سنتا اور دل میں خوش ہوتا ہوا قاضی کے حوض پر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دونوں جانب ٹٹیاں لگا کر ان میں روشنی کے گلاس جما کر رات کو دن کر دیا ہے۔ سڑک پر خوب چھڑکاؤ ہے، کٹورا بج رہا ہے۔ مبارک النساء بیگم کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں قمقموں اور قندیلوں سے سجا کر گلزار آتشیں کر دیا ہے۔ صدر دروازے سے اندر کی دہلیز تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں چکا چوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے۔ یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے۔ یا کسی شاہی محل میں آگیا ہوں گھڑی گھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا اور کہتا، واہ میاں عارف واہ! تم نے تو کمال کر دیا۔ کہاں بیچارے کریم الدین کا مکان اور کہاں یہ بادشاہی ٹھاٹھ واقعی تمہارا کہنا صحیح تھا کہ اگر دو ہزار میں بھی کام نکل جائے تو یہ سمجھو کہ کچھ نہیں اٹھا، چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی جس کی وجہ سے در و دیوار جگ مگ کر رہے تھے۔ صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہو گئے تھے۔ تختوں پر دری چاندنی کا فرش، اس پر قالینوں کا حاشیہ۔ پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار۔ جھاڑ فانوس لالٹین ہانڈیوں دیوار گیروں، قمقموں، چینی قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقعہ نور بن گیا تھا۔ جو چیز تھی خوبصورت اور جو شے تھی قرینہ سے۔ سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ، گنگا جمنی چوبوں پر سبز ہی ریشمی طنابوں سے استادہ تھا اسکے نیچے

سبز مخمل کی کارچوبی مسند، پیچھے[1] سبز کارچوبی گاؤ تکیہ، چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس کسے ہوئے! فانوسوں کے کنول بھی سبز چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح لٹکے ہوئے، بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتوئی ڈوریوں سے جن کے سروں پر مقیش کے گچھے تھے۔ اسی طرح چوبوں پر کس دیا گیا تھا۔ کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے تھے، دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیوں پر اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکا دیئے تھے۔ اس سرے سے لگا کر اس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشیہ سبز تھے۔ کھنچی ہوئی تھی چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا گیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی۔ ایک صحنچی میں پانی کا انتظام تھا۔ کورے کورے گھڑے رکھے تھے۔ اور شورے میں جست کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں۔ دوسری صحنچی میں پان بن رہے تھے۔ باورچی خانہ میں حقوں کا تمام سامان سلیقے سے جما ہوا تھا۔ جا بجا نوکر صاف ستھرا لباس پہنے دست بستہ مودب کھڑے تھے۔ تمام مکان مشک و عنبر اور اگر کی خوشبو سے پڑا مہک رہا تھا۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر حقوں کی قطار تھی، حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی دوکان پر سے اٹھ آئے ہیں۔ حقوں کے بیچ میں جو کچھ جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھ کر ان پر خاصدان رکھ دیئے تھے۔ خاصدانوں میں لال قند کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان۔ گلوریوں کو صافی میں اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک تہ پھولوں کی آگئی تھی خاصدانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں ان میں الائچیاں چکنی ڈلیاں اور بن دھنیا مسند کے سامنے چاندی کے دو شمعدان اندر کافوری بتیاں اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول۔ شمعدانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن، لگنوں میں کیوڑا، غرض کیا کہوں ایک عجیب تماشا تھا

[1] سبز رنگ دہلی کا شاہی رنگ تھا۔

میں تو الف لیلیٰ کا ابوالحسن ہوگیا۔ جدھر نظر جاتی ادھر ہی کی ہو رہتی۔ میں اس تماشے میں محو تھا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔[1]

سب سے پہلے مرزا کریم الدین رسا آئے یہ سلاطین زادنے ہیں، کوئی ستر برس کے پیٹے میں ہیں۔ استعداد علمی تو کم ہے مگر شاعری میں اپنی برابر کسی کو نہیں سمجھتے بہت رحمدل، خوش خلق اور سادہ مزاج ہیں، دخل فصل نام کو نہیں ہے، ملاح کہا کرتے ہیں کہ کشتی میں "چڑھے سب سے پہلے اور اترے سب سے پیچھے" انھوں نے اس مقولہ کو مشاعرے سے متعلق کر دیا ہے، مشاعرے میں سب سے پہلے آتے ہیں اور جبتک ایک ایک کرکے سب نہ چلے جاتے یہ اٹھنے کا نام نہ لیتے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مشاعرہ ہو رہا تھا، بڑے زور سے ابر آیا، سب نے جلدی جلدی مشاعرہ ختم کیا لوگ اپنے اپنے گھر گئے لیکن یہ ٹھہرے اپنی وضع کے پابند جب تک سب نہ جا چکے اپنی جگہ سے نہ اٹھے۔ ہاں گھڑی گھڑی جھک جھک کر آسمان دیکھ لیتے اتنے میں موسلا دھار مینہ برسنا شروع ہوا۔ ایسا برسا ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے کہیں دو گھنٹہ کے بعد خدا خدا کرکے ذرا مینہ تھما تو یہ بھی اٹھے مگر ایسا اندھیرا گھپ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا مالک مکان نے ایک نوکر کو قندیل دے کر ساتھ کر دیا۔ گلیوں میں ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا۔ ان بیچارے کے پاؤں میں زردوزی کا قیمتی جوتا کیچڑ میں پاؤں رکھیں تو کیسے رکھیں۔ آخر چپکے سے نوکر سے کہا کہ تو اپنا جوتا مجھے دیدے اسکا جوتا کیا تھا۔ لیتڑے تھے، دہی گھسیٹتے ہوئے چلے۔ اپنا جوتا بغل میں دبا لیا۔ قلعہ پہنچ کر ایک نیا جوتا نوکر کو دیا اور کہا، میاں تو نے آج میرے ساتھ احسان کیا ہے کہ تمام عمر نہ بھولوں گا۔ جب کبھی تجھے کوئی ضرورت ہو تو میرے پاس آجایا کیجیو آگے چل کر اس بدمعاش نے انکو بہت دق کیا۔ اول تو اس راز کا ڈھنڈورا پیٹ دیا دوسرے ہر تیسرے ان سے ایک دو روپیہ مار لاتا۔ مگر انھوں نے کبھی نہ نہیں کی جب جاتا کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کر دیتے

[1] بزرگوں کی زبانی دیوان عام کے مشاعروں کا جو حال میں نے سنا ہے بجنسہ اسی پر مشاعرہ کا نقشہ قائم کیا ہے

نواب زین العابدین خاں صاحب نے بڑھ کر لب فرش ان کو لیا اور پوچھا ہیں صاحب عالم! میاں حیا آپ کے ساتھ نہیں آئے۔ مرزا رحیم الدین حیا ان کے بڑے بیٹے ہیں۔ لیکن تھوڑے دنوں سے باپ بیٹے میں کچھ صفائی نہیں رہی ہے نواب صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ صاحب عالم ناسور کی طرح پھوٹ بہے کہنے لگے نواب! وہ بھلا میرے ساتھ کیوں آتے جب سے بنارس ہو کر آئے ہیں ان کا تو رنگ ہی بدل گیا میں بیچارہ تو کس گنتی میں ہوں وہ کسی کو بھی اب خاطر میں نہیں لاتے۔ پالا پوسا، بڑا کیا، پڑھایا۔ لکھایا شاعر بنایا، بٹیریں لڑانا سکھایا، تخت[1] کی قسم وہ وہ نسخے بٹیروں کے بتائے ہیں کہ قلعہ تو قلعہ ہندوستان بھر میں کسی کے فرشتے خاں کو بھی معلوم نہ ہوں گے، اور اب وہی صاحبزادے صاحب ہیں کہ استاد ماننا تو درکنار مجھ کو باپ بھی کہتے شرماتے ہیں ہاں بھئی کیوں نہ ہو تیرھویں صدی ہے۔ ان کو بنارس بھیج کر میں مصیبت میں آگیا۔ ایک نقصان مایہ دوسرے شماتت ہمسایہ۔ بیٹا ہاتھ سے گیا تو گیا، دن رات کی دنتا کلکل اور مول لے لی۔ یہ باتیں کرتے کرتے نواب صاحب نے میاں رسا کو لیجا ایک جگہ بٹھا دیا ان سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ شہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبدالرحمٰن احسان کو جھرمٹ میں لئے آپہنچا۔ بھلا دلی شہر میں کون ہے جو "حافظ جیو" کو نہ جانتا ہو جگت استاد ہیں پہلے تو قلعہ کا قلعہ ان کا شاگرد تھا۔ مگر استاد ذوق کے قلعہ میں قدم رکھتے ہی ان کا زور ذرا ٹوٹا یہ بھی زمانہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اور شاہ نصیر سے ٹکریں لے چکے تھے اس بڑھاپے میں بھی خم ٹھونک کر سامنے آگئے اور مرتے دم تک مقابلے سے نہ ہٹنا تھا نہ ہٹے کوئی ۹۰ برس کی عمر تھی کمر دوہری ہونے سے قد کمان بن گیا تھا۔ اپنے زمانہ کے بلعم باعور تھے لیکن غزل اس کڑاکے سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھاتے تھے انکی استادی کا سکہ ایک زمانہ سے

[1] آئے دن کی خانہ جنگیوں نے ہر شہزادہ کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ شاید کل میں ہی بادشاہ ہو جاؤں اسلئے قلعہ کے سب لوگ خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے ہمیشہ تخت کی تاج کی اسی طرح کی قسمیں کھایا کرتے

تمام دلی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے مرزا نیلی کے استاد ہوئے تھے رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نوراللہ مرقدہ تک رسائی ہو گئی۔ وہ ان کو "حافظ جیو" کہتے تھے اس لئے اس نام سے تمام قلعہ میں مشہور تھے، مصرعہ پر مصرعہ لگانے میں کمال تھا اور سند ایسی تراخ سے دیتے تھے کہ معترض منھ دیکھتے رہ جاتے تھے ایک روز بادشاہ سلامت نے مصرعہ کہا ؂

صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے اے ماہ نہیں

انھوں نے فوراً عرض کی۔

نامناسب ہے میاں وقت سحرگاہ نہیں

کسی نے "وقت" "سحرگاہ" کی ترکیب پر اعتراض کیا انھوں نے جھٹ صائب کا یہ شعر پڑھا۔

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد خوب در وقت سحرگاہ گراں می گردد

بڑے دبلے پتلے آدمی تھے، رنگ بہت کالا تھا شاہ نصیر نے اسی رنگ کا خاکہ اسی طرح اڑایا ہے۔

اے خال رخ یار تجھے ٹھیک بناتا پر چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

نواب صاحب نے ان سب کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اپنی اپنی جگہ لاکر بٹھایا ابھی ان کو بٹھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی محمد علی تشنہ، چم ننگے، نشے میں چور جھومتے جھامتے اندر آئے۔ نوجوان آدمی ہیں۔ مگر عجیب حال ہے کبھی برہنہ پڑے پھرتے ہیں کبھی کپڑے پہن خاصے بھلے آدمی بن جاتے ہیں کسی کے شاگرد نہیں اور پھر سب کے شاگرد ہیں۔ کبھی حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگتے ہیں۔ کبھی استاد ذوق کے پاس اصلاح کیلئے غزل لے آتے ہیں۔ ذہن بلا کا پایا ہے، لاکھوں شعر زبان کی نوک پر ہیں۔ شعر سنا اور یاد ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ کسی کی غزل سنی اور یاد کر لی مشاعرے میں خود اپنے نام سے وہ غزل پڑھ ڈالی اور وہ بیچارہ منھ دیکھتا رہ گیا نواب صاحب آگے بڑھے پوچھا منشی جی یہ

کیا رنگ ہے۔ کہنے لگے۔ اصلی رنگ۔ مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے نواب صاحب نے کہا ابھی شروع ہوتا ہے۔ آپ بیٹھئے تو سہی۔ خیر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ میاں عارف نے ان پر ایک دوشالہ رکھ دیا۔ انھوں نے اٹھا کر پھینک دیا غرض جس طرح ننگے آئے تھے بلا تکلف بیٹھے رہے۔ اسکے بعد تو لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا جو آتا اس کا استقبال نواب صاحب کرتے اور لا لاکر بٹھاتے۔ حکیم مومن خاں آئے ان کے ساتھ آزردہ شیفتہ، صہبائی اور مولوی مملوک العلی تھے۔ مولوی صاحب مدرسہ دہلی میں مدرس اول ہیں، عجیب باکمال آدمی ہیں، مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانہ میں کسی استاد سے ہوا ہو۔ بہت پابند شرع ہیں، اس لئے خود شعر نہیں کہتے۔ مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ ان کا کسی شعر کی تعریف کر دینا گویا اس کو دوام کی سند دے دینا ہے کوئی ۶۰ سال کا سن ہے رہنے والے تو نانوتے کے ہیں۔ مگر مدت سے دہلی میں آ رہے ہیں دن رات پڑھنے پڑھانے سے کام ہے مشاعروں میں کم جاتے ہیں۔ یہاں شاید مولانا صہبائی انکو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے، تھوڑے ہی دن ہوئے بیچارے پابندی شرع اور تقوی کی وجہ سے چکر میں آ گئے تھے، ہوا یہ کہ رزیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آئے ان کے علم اور رتبہ کے خیال سے ہاتھ ملایا جب تک صاحب بہادر وہاں رہے انھوں نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے صاحب کے جاتے ہی احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا کسی نے جا کر صاحب سے یہ بات لگا دی انکو بہت غصہ آیا کہ ہم نے تو ہاتھ ملا کر انکی عزت کی انھوں نے اس طرح ہماری توہین کی غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا[1]۔

مولوی صاحب میرے استاد تھے، میں بھی آگے بڑھا۔ آداب کیا فرمانے لگے میاں کریم الدین میں تم کو ایسا نہ سمجھتا تھا۔ تم نے تو دہلی والوں کو بھی مات کر دیا سبحان اللہ سبحان اللہ

---

[1] اس واقعہ کا ذکر ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے ابن الوقت میں کیا ہے مگر نام نہیں لکھا مجھے یہ واقعہ ان ہی کی زبانی معلوم ہوا سن کر تعجب ہوا تھا۔ اب ایسے بہت سے لوگوں کو خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیا

کیا انتظام دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ خدا تمھیں اس سے زیادہ حوصلہ دے۔ میں نے عرض کی مولوی صاحب بھلا میں کیا اور میری بساط کیا۔ یہ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خان کا ہے فرمانے لگے۔ بھئی یہ بھی اچھی ہوئی وہ کہیں کہ سارا انتظام کریم الدین خان کا ہے تم کہو نواب صاحب کا ہے چلو "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"، ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مرزا نوشہ پالکی میں سے اترے۔ نیر، علائی۔ سالک اور حزیں ان کے ہمراہ تھے مرزا غالب آتے ہی مومن خاں کی طرف بڑھے، مصافحہ کیا اور کہا بھی حکیم صاحب آج محمد ناصر خاں محزون کا عظیم آباد سے خط آیا تھا، تم کو بہت بہت سلام لکھا ہے معلوم نہیں کہ کیوں ایکا ایکی پٹنہ چلے گئے۔ خواجہ میر درد کے پوتے ہو کر ان کا دہلی کو چھوڑنا ہم کو پسند نہیں آیا۔ اب یاروں کو روتے ہیں دیکھنا کیا درد بھرا شعر لکھا ہے۔

آہ محزون مجھے یاران وطن بھول گئے ۔۔۔ نہ تو نامہ ہی نہ پیغام زبانی آیا

ارے بھی رات تو خاصی آگئی ہے۔ ابھی تک میاں ابراہیم نہیں آئے۔ آخر مشاعرہ شروع کب ہوگا، حکیم صاحب کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ دروازے کے پاس سے "السلام علیکم" کی آواز آئی۔ مولانا صہبائی نے کہا، اے لیجئے مرزا صاحب وہ استاد کے نشان کے ہاتھی حافظ ویران صاحب آگئے اور وہ آپ کے دوست ہدہد بھی ساتھ ہیں دیکھئے آج کس کے چونچ مارتے ہیں، میاں ہدہد کا نام عبدالرحمٰن ہے پورب کے رہنے والے ہیں، دہلی میں آکر حکیم آغا جان عیش کے یہاں ٹھہر گئے ہیں۔ ان کے بچوں کو پڑھاتے ہیں حکیم صاحب ہی کے مشورہ سے ہدہد تخلص اختیار کیا انہی کی تجویز سے جگی داڑھی رکھی سر منڈا کر ان کو عمامہ باندھا اور اس طرح خاصے کھٹ بڑھئی ہو گئے۔ انہی کے ذریعہ سے دربار میں پہنچے اور طائر الاراکین شہیر الملک ہدہد الشعرا منقار جنگ بہادر خطاب پایا۔ شروع شروع میں تو ان کے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ چمک جاتا تھا مگر بعد میں انھوں نے استادوں پر حملے شروع کئے کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم صاحب کے اشارہ سے ایسا کیا لیکن کچھ

بھی ہو آخر سب کو ان سے کچھ نفرت سی ہو گئی۔ اور بجائے دوسروں کا مذاق اڑانے کے خود ان کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ حکیم صاحب تو علانیہ ان کی مدد کر نہیں سکتے تھے خود ان میں اتنی قابلیت نہ تھی۔ جو دلی والوں کی پھبتیوں کو سنبھال سکتے تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈے ہو کر رہ جاتے مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے ہمیشہ منھ آتے تھے اسی لئے مولانا صہبائی کے منہ سے "آپ کے دوست" کا لفظ سن کر مرزا نوشہ مسکرائے اور کہا بھئی میں تو ان کے منہ کیوں لگنے لگا مگر آج دیکھا جائے گا "ہر فرعونے را موسیٰ" سنتا ہوں کہ ہمارے میر صاحب مولوی ہدہد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں، ان کے سامنے اگر یہ شہباز سخن اٹک گئے۔ تو میں سمجھوں گا بڑا کام کیا۔ غرض یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ استاد ذوق بھی اندر آ گئے تمام قلعہ ان کے ساتھ الٹ آیا تھا صاحب سلامت کر کے سب اپنی جگہ بیٹھ گئے قلعہ والوں اور ان لوگوں میں جن کا تعلق قلعہ سے ہے سلام کرنے کا کچھ عجیب طریقہ ہے سیدھے کھڑے ہو کر دایاں ہاتھ اس طرح کان تک لے جاتے ہیں۔ جیسے کوئی نماز کی نیت باندھتا ہے اور پھر چھوڑ دیتے ہیں چلو سلام ہو گیا۔ باقی سب لوگوں سے معمولی طرح سلام کرتے ہیں۔ قلعہ والوں کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک ہی نظر میں پہچان لئے جاتے ہیں شہزادے ہوں یا سلاطین زادے سب کی وضع قطع ایک سی ہے وہی پتلی اونچی ناک، لمبا کتابی چہرہ بڑی بڑی لمبوتری آنکھیں، بڑا دہانہ، اونچا چوکا۔ آنکھوں کے نیچے کی ابھری ہوئی ہڈیاں گہرا سانولا رنگ، داڑھی کلوں پر ہلکی، ٹھوڑی پر زیادہ غرض جیسی مشابہت ان لوگوں میں ہے شاید ہی کسی خاندان والوں میں ہوگی امیر تیمور سے لگا کر اسوقت تک ان کی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا ہے پہلے تو قلعہ بھر کا ایک ہی لباس [له]

---

له اس مضمون میں جابجا دہلی والوں کے لباس کا ذکر آیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا وضاحت سے اس لباس کو بتا دوں تاکہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے اس محفل کا نقشہ اور اچھی طرح پھر جائے مرزا نوشہ کا تو ذکر جانے ہی دو وہ تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں انکی ٹوپی دنیا بھر سے جدا

باقی صفحہ ۱۶۷

تھا مگر اب دورنگی ہو گئی ہے وجہ یہ ہوئی ہے کہ جب سلیمان شکوہ کا۔ اودھ کے دربار میں رسوخ ہوا۔ خاندان کے کچھ لوگ تو وہیں جا رہے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ بنارس آتے جاتے رہتے ہیں۔ جو وہاں جا کر آتا ہے لباس میں نئی تراش خراش کرتا ہے۔ اس طرح اس کا لباس آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر نہ لکھنؤ کا رہتا ہے نہ دہلی کا۔

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۶) تھی۔ نہ ترکی نہ تاتاری کھال کی (خواہ وہ سمور ہو یا برہ) اس طرح سے لیا جاتا تھا کہ نیچے کا گھیر اوپر کے چندوے سے ذرا بڑا رہے، اسکے بعد چار کنگرے قائم کر کے کھال کو ٹوپی کی آدھی لمبان کاٹ کر کہ ٹوپی گرگج کی شکل بن گئی۔ بیچ میں چندوے کی جگہ مخمل یا گہرے رنگ کی بانات کنگروں کے کنارے سے ملا کر سی لی، اندر استر دیدیا، چلو مرزا نوشہ کی ٹوپی ہو گئی، شہر میں کلاہ ترکی کا بہت استعمال ہے جس کو عام اصطلاح میں چوگوشیہ ٹوپی کہتے ہیں، یہ بھی کئی وضع کی ہوتی ہیں اور کئی طرح پہنی جاتی ہیں جو ٹوپی شرفا استعمال کرتے ہیں اسکا دمہ (گوٹ)، ذرا نیچا ہوتا ہے۔ دمے کے اوپر چار پاکھے کی وضع بالکل شاہجہانی محراب کی سی ہوتی ہے چاروں کو اس طرح ملا کر سیتے ہیں کہ چاروں گوشے گرگج (کمرخ) کے نمونے ہو جائیں بعض لوگوں نے اسمیں ذرا جدت بھی کی ہے، وہ یہ کہ دمے کو اونچا کر کے پاکھوں کی لمبان کو چوڑان سے کسی قدر بڑھا دیا ہی اور ان کے سل جانے سے جو پہل پیدا ہوئے ہیں انکو پھر کاٹ کر کلیاں ڈالدی ہیں اس طرح بجائے چار پہل کے آٹھ پہل ہو گئے ہیں۔ خوبصورتی کیلئے دمے کے کناروں پر تلی لیں اور گوشوں کے کناروں پر باریک قیطون لگاتے ہیں، بادشاہ سلامت کی ٹوپی ہوتی تو اسی نمونے کی ہے مگر سلمی ستارے کے کام سے لپی ہوئی اور جا بجا موتی اور نگینے ٹکے ہوئے اس قسم کی ٹوپی کئی طرح پہنی جاتی تھی قلعہ والے تو پاکھوں کو کھڑا رکھتے ہیں باقی لوگ ان کو کسی قدر دبا لیتے ہیں جو ٹوپی آٹھ پہل کی ہوتی ہے اس کے پاکھوں کو تو اتنا دباتے ہیں کہ گوشے دمے کے باہر پھیل کر کنول کی شکل بن جاتے ہیں اس قسم کی ٹوپی ہمیشہ آڑی پہنی جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا ایک کونہ بائیں بھوں کو دبائے اس ٹوپی کے علاوہ ارخ چین (عرق چین)، کی ٹوپی کا بھی بہت رواج ہے اسکا بنانا کچھ مشکل کام نہیں ایک مستطیل کپڑے کی (باقی صفحہ ۱۶۸)

اب جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں انہی کو دیکھ لیجیے۔ جو شہزادے لکھنؤ جا کر آئے ہیں انکے سر پر دوپلڑی ٹوپی ہے، اونچی چولی کا انگرکھا ہے، نیچے باریک شربتی ململ کا کرتہ اور تنگ پجامہ ہے۔ جنھوں نے قلعہ کبھی نہیں چھوڑا۔ ان کے جسم پر وہی پرانا لباس ہے، سر پر چوگوشیہ ٹوپی۔ جسم پر نیچی چولی کا انگرکھا، اس کے اوپر مخمل یا جامہ وار کی خفتان پاؤں میں گلبدنی یا

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۷) کناروں کو سر کی ناپ کی برابر سی لیا نیچے تپلی سی گوٹ دیدی اور اوپر کے حصہ میں جینٹ دیکر چھوٹا سا گول گتہ لگا دیا۔ دہلی کی دوپلڑی ٹوپی اور لکھنؤ کی ٹوپی میں پانچ گوشے ہوتے ہیں لیکن اس کی کاٹ کر چوگوشیہ ٹوپی سے ذرا مختلف ہے گوشوں کے اوپر کے حصے بس ایسے ہوتے ہیں جیسے فصیل کے کنگرے، نیچے دمے کی بجائے تپلی سی گوٹ ہوتی ہے۔ یہ ٹوپی قالب کے خاکے پہنی جاتی ہے قالب چڑھ کر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ہمایوں کے مقبرہ کا گنبد۔ عام لوگوں میں بڑے گول چندوے کی ٹوپی کا بہت استعمال تھا بعض تو بالکل سادی ہوتی ہے اور بعض سوزنی کے کام یا فیتے کے کام کی ہوتی ہیں۔ اس ٹوپی کو بھی قالب چڑھا کر پہنتے ہیں لباس میں انگرکھا بہت پسند کیا جاتا ہے دہلی کے انگرکھے کی چولی اتنی نیچی ہوتی ہے کہ ناف تک آتی ہے چونکہ ہر شخص کو کسرت کا شوق ہے اس لئے جسم کی خوبصورتی دکھانے کیلئے آستین بہت چست رکھتے ہیں۔ اور بعض شوقین آستینوں کو آگے سے کاٹ کر الٹ لیتے ہیں انگرکھے کے نیچے کرتہ بہت کم لوگ پہنتے ہیں قلعہ والوں کے انگرکھے کے اوپر جامہ وار یا مخمل کی خفتان ہوتی ہے بہت تکلف کیا تو اسکے حاشیوں پر سمور لگا لیا نہیں تو عموماً تپلی لیس لگاتے ہیں، بٹنوں کی بجائے صرف ایک تکمہ اور گھنڈی ہوتی ہے جس کو عاشق و معشوق یا چشمے کہتے ہیں اسکی آستینیں ہمیشہ آدھی ہوتی ہیں۔ قلعے میں تو اس کو خفتان کہا جاتا ہے۔ مگر شہر میں اس سینہ کھلے نیمہ آستین کو شیروانی کہتے ہیں۔ انگرکھے کے اوپر جو کور شالی رومال سموسہ کر کے پٹیہ پر ڈال لیتے ہیں اس رومال کو عام اصطلاح میں ارخ چین دعرق چین) کہتے ہیں کمر میں بتی کر کے رومال لپیٹنے کا رواج ہے۔ مگر بہت کم پجامہ ہمیشہ قیمتی کپڑے کا ہوتا ہے اکثر گلبدنی، غلطے، مشروع، موٹرے، اطلس یا گورنٹ کا ہوتا ہو پرانی وضع کے جو لوگ ہیں وہ تو اب بھی ایک بری کا پجامہ پہنتے ہیں مگر تنگ مہریوں کے پجامہ بھی (باقی صفحہ ۱۶۹ پر)

غلطے کا ایک برکا پیجامہ۔ جو لوگ لکھنؤ آئے ہیں انھوں نے دہلی کے لباس کے ساتھ داڑھی کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے، چہرے کی ساخت سے ان کو دہلی کا شہزادہ تو کہہ دو مگر لباس اور وضع قطع سے تو یہ ٹھیٹھ لکھنؤ والے معلوم ہوتے ہیں۔

استاد ذوق سب سے مل ملا کر شامیانے کے دائیں طرف بیٹھ گئے، مشاعرے میں شعرا کو سلسلے سے بٹھانا بھی ایک فن ہے۔ نواب زین العابدین خاں کی تعریف کروں گا کہ جس کو جہاں چاہے بٹھا دیا اور پھر اس طرح کہ کسی کو نہ کوئی شکوہ ہوا نہ شکایت۔ اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا۔ جہاں ان کے خیال میں اس کو نہ بیٹھنا چاہئے تھا۔ تو بجائے اس کے کہ اسکو وہاں سے اٹھاتے خود ایسی جگہ جا بیٹھتے، جہاں اس کو بٹھانا چاہتے، تھوڑی دیر کے بعد کہتے۔ ارے بھئی ذرا ایک بات تو سننا۔ وہ اگر ان کے پاس بیٹھ جاتا۔ اس سے باتیں کرتے رہتے۔ اتنے میں کوئی ایسا شخص آجاتا جس کو وہ خالی جگہ کیلئے موزوں سمجھتے اس سے کہتے تشریف رکھئے وہ خالی جگہ ہے۔ جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے سے اٹھ جاتے اور اس طرح دو نشستوں کا انتظام ہو جاتا۔ شہزادوں کا سلسلے سے بٹھانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے ذرا ذرا سی بات پر بگڑ کر اٹھ جاتے ہیں کہ واہ ہم یہاں بیٹھیں پھر لاکھ منائیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۸) چل نکلے ہیں۔ سلیم شاہی جوتی کا استعمال شروع ہو گیا ہے، پھر بھی دہلی کے شرفا گھتیلی جوتی زیادہ پسند کرتے ہیں شاید ہی شہر میں کوئی ہو گا جس کے ہاتھ میں بانس کی پکڑی (؟) دو گز بھر لیٹے چوکور رومال نہ ہو ڈھونڈے ڈھونڈے کر لمبی پور کا ٹھوس بھاری بانس لیتے، تیل پلاتے ملیدھی مل کر باورچی خانے میں لٹکاتے یہاں تک کہ اس کی رنگت بدلتے بدلتے سیاہ ہو جاتی اور روزن تو ایسا ہوتا گویا سیسہ پلا دیا ہے۔ جو نکلتا اینٹھتا ہوا نکلتا ہے جس کو دیکھو چوڑا سینہ پتلی کمر، بنے ہوئے ڈنڈ، شرفا میں تو شاید ڈھونڈھے سے ایک بھی نہ نکلے گا جس کو کسرت کا شوق نہ ہو اور بانک، بنوٹ اور لکڑی نہ جانتا ہو۔ بچپن ہی سے ان فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مقابلے ہوتے ہیں واہ واہ سے بچوں اور نوجوانوں کا دل بڑھاتے ہیں اور فنون سپاہ گری کو شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں۔

وہ بھلا کیا ماننے والے ہیں۔ ان جھگڑوں کو استاد ذوقؔ خوب سمجھتے تھے اس لئے اپنے ساتھ والوں کا انتظام انھوں نے خود کر لیا، مگر اس طرح کے کہ کسی کو یہ خیال ہی نہیں ہوا کہ یہ محفل کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کسی سے کہتے صاحب عالم ادھر آئیے کسی سے کسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کرتے کہتے بیٹھو بھئی بیٹھو۔ غرض تھوڑی دیر میں مجلس جم گئی نشست کا یہ انتظام تھا کہ میر مشاعرہ کے دائیں جانب وہ لوگ تھے جن کا تعلق قلعے سے تھا۔ اور بائیں طرف شہر کے دوسرے استاد اور انکے شاگرد، ایک چیز جو مجھے عجیب معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ قلعے والے جتنے آئے تھے سب کے ہاتھوں میں بٹیریں دبی ہوئی تھیں، یہ بٹیر بازی اور مرغ بازی کا مرض قلعہ میں بہت ہے روزانہ تیتروں بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ہوتی ہیں ایک شہزادے صاحب نے تو کمال کیا ہے۔ ایک بڑے چھکڑے پر ٹھاٹھر لگا کر چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے اور اوپر چھت پر مٹی ڈال کر کنگنی بودی ہے ٹھاٹھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو لاکھوں ہی پدڑیاں۔ جہاں چاہا چھکڑا لے گئے اور پدڑیاں اڑا دیں، ایسی سدھی ہوئی کہ جھلڑ سے ایک بھی پھٹ کر نہیں جاتی، انھوں نے جھنڈی ہلائی اور وہ اڑیں، انھوں نے آواز دی اور وہ آکر چھت پر بیٹھ گئیں۔

استاد ذوقؔ کو آئے ہوئے چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ مرزا فتح الملک ہوادار میں سوار آ پہنچے۔ ان کے ساتھ نواب مرزا خاں داغؔ تھے۔ میاں داغ کی کوئی سولہ سترہ[۱] برس کی عمر ہو گی، رنگت تو بہت کالی ہے مگر چہرے پر غضب کی نرماہٹ ہے، بڑی بڑی غلافی آنکھیں ستواں ناک، کشادہ پیشانی، سر پر سیاہ مخمل کی لیس لگی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی۔ جسم میں ساسلیٹ کا انگرکھا سبز گلبدنی کا پجامہ، ہاتھ میں ریشمی رومال ہیں تو ابھی نوعمر مگر شعر ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ شہر میں ان کی غزلیں گائی جاتی ہیں۔ غرض ہوادار فرش سے ملا کر لگا دیا گیا۔ پہلے میاں داغ اترے۔ اور اتر کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ان کے بعد

---

[۱] مرزا فخرو کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ کے آنے کی وجہ تھی کہ نواب شمس الدین خاں کے پھانسی

مرزا فتح الملک اترے ان کا نیچے قدم رکھنا تھا کہ سب سرو قد کھڑے ہوئے چار چوبدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں باندھے نیچی نیچی سبز بانات کی چکنیں پہنے۔ سرخ شالی رومال کمر سے لپیٹے ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مورچھل لئے ہوادار کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ اس سلسلے سے یہ جلوس آہستہ آہستہ شامیانے تک آیا مرزا فخرو نے شامیانے کے قریب کھڑے ہو کر سب کا سلام لیا، پھر چاروں طرف نظر ڈال کر کہا اجازت ہے سب نے کہا بسم اللہ بسم اللہ اجازت پاکر یہ شامیانے میں گئے اور سب کو سلام کرکے بیٹھ گئے۔ دوسرے سب لوگ بیٹھنے کی اجازت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سب کی طرف نظر ڈال کر کہا تشریف رکھئے، سب لوگ سلام کرکے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے استاد ذوق نے داغ کو اپنے قریب ہی ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ وہاں جا بیٹھے۔ مورچھل بردار شامیانے کے پیچھے اور عصا بردار سامنے کی صف کی پشت پر جا کھڑے ہوئے جب یہ سب انتظام ہو گیا تو نواب زین العابدین خاں آگے بڑھے، شامیانے کے پاس جا کر تسلیمات بجا لائے اور دو زانو ہو کر بیٹھ گئے، چپکے چپکے صاحب عالم سے کچھ باتیں کیں اور پھر اٹھ کر اپنی جگہ بیٹھے ان کے اٹھ کر چلے جانے کے بعد نواب فتح الملک نے دونوں ہاتھ فاتحہ کو اٹھائے ساتھ ہی اہل مجلس نے ہاتھ اٹھائے۔ فاتحہ خیر کے بعد صاحب عالم نے فرمایا خوشنوایان چمن دہلی! میری کیا بساط ہے، جو آپ جیسے استادان فن کے ہوتے ہوئے یہ مشاعرہ کرنے کا خیال بھی دل میں لا سکوں صرف حضرت پیر و مرشد کے فرمان کی تعمیل میں حاضر خدمت ہو گیا ہوں ورنہ کہاں میں اور کہاں ایسے بڑے مشاعرے۔ اس مشاعرے کی ایک خصوصیت

---

پانے کے بعد اس کی بیوی یعنی داغ کی والدہ کا نکاح مرزا فخرو سے ہو گیا تھا اور اسی نسبت سے داغ قلعہ میں رہتے تھے (نواب فتح الملک کا عرف مرزا فخرو تھا)

لہ نواب فتح الملک بڑے کٹے مسلمان تھے۔ کوئی کام بغیر فاتحہ خیر کے شروع نہ کرتے تھے اسی لئے سب قلعے والے ان کو ملا ملیٹا کہا کرتے تھے۔

تو آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لئے کوئی "طرح" نہیں دی گئی۔ اس کی دوسری خصوصیت آپ یہ پائیں گے کہ بجائے ایک شمع کے دو شمعیں گردش کریں گی جس طرح "طرح" کے نکل جانے نے ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر و مباہات کا دروازہ بند کردیا ہے اسی طرح دو شمعوں کی وجہ سے پڑھنے میں تقدیم و تاخیر کے جو خیالات طبیعتوں کو مکدر کرتے تھے وہ بھی رفع ہو جائیں۔ مشاعرے کی ابتدا کرنے اور ختم کرنے کا خیال بھی اکثر دلوں میں فرق ڈالتا ہے لیکن اس مشاعرے میں میں نے انتہا کو ابتدا کردیا ہے۔ چنانچہ حضرت ظل سبحانی کے کلام معجز نظام سے مشاعرے کی ابتدا ہوگی۔ اور اس کے بعد ہی میں اپنی غزل عرض کرکے ابتدا اور انتہا کے فرق کو مٹا دوں گا۔ یہ کہہ کر مرزا فخرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا دونوں چوبدار جو سامنے کھڑے تھے دونوں شمعیں اٹھا کر ان کے سامنے لائے۔ انھوں نے بسم اللہ کہہ کر فانوس اتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیئے چوبداروں نے شمعیں لے جاکر لگنوں میں رکھ دیا اور سیدھے کھڑے ہوکر مرزا فخرو کی طرف دیکھا، انھوں نے گردن سے اشارہ کیا اشارہ پاتے ہی دونوں چوبداروں نے باآواز کہا حضرات مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔

اس آواز کو سننا تھا کہ سناٹا ہوگیا۔ قلعے والوں نے بٹوے تھیلیوں میں بند کر تکیوں کے پیچھے رکھ دیں، نوکروں نے جھٹ پٹ حقے سامنے سے ہٹا دیئے اور انکی جگہ سب کے سامنے اگالدان، خاصدان، اور بن دھنیے کی طشتریاں رکھ اپنی اپنی جگہ جاکر کھڑے ہوئے۔ اتنے میں بارگاہ جہاں پناہی کا خواصی بادشاہ سلامت کی غزل لئے ہوئے قلعے سے آیا۔ اس کے ساتھ کئی نقیب تھے۔ وہ خود شمع کے قریب آکر تسلیمات بجالایا۔ اور غزل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مرزا فخرو نے گردن کے اشارے سے اجازت دی وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی۔

حاضرین! حضرت ظل سبحانی، صاحب قرآن ثانی خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کا کلام معجز نظام پڑھا جاتا ہے، نہایت ادب کے ساتھ گوش دل سے سماعت فرمایا جائے۔

# تکمیل

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے

نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہلِ محفل دو زانو ہو کر سنبھل کر بیٹھ گئے اور پاس ادب سے سب نے گردنیں جھکا لیں۔ خواصی نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطے میں سے نکالی بوسہ دیا، آنکھوں سے لگا لیا اور بلند آواز سے سورٹھ کے سروں میں پڑھنا شروع کیا الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی، مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا۔ ایک کیفیت تھی کہ زمین سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی، کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا استادانِ فن ہر شعر پر جھومتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے منھ سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کے الفاظ بہت نیچی آواز میں نکل گئے ورنہ ساری مجلس پر ایک عالم بیخودی طاری تھا مقطع پر تو یہ حال ہوا جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا ہر شخص وجد میں جھوم رہا تھا۔ باصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف اٹھایا۔ لیجیے آپ بھی پڑھیے اور زبان کے مزے لیجیے۔

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غم عشق تو اپنا رفیق رہا۔ کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے، دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

ہمیں ساغر بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہد نشاط یہ دور طرب رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیر ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
دلے ناز و کرشمہ کی تیغ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غزل پڑھ چکنے کے بعد خواص نے کاغذ مرزا فخرو کے ہاتھ میں دیا زرافشاں کاغذ پر خود حضرت ظل اللہ کے قلم کی لکھی ہوئی غزل تھی۔ خط ایسا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں کھبا جاتا تھا۔ مرزا فخرو نے کاغذ لے کر ادھر ادھر کیا۔ مملوک العلی نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا صاحب عالم ہمارا کیا منہ ہے جو ہم حضرت ظل سبحانی کی غزل کی جیسے چاہیے ویسی تعریف کر سکیں۔ البتہ ان نوازشات شاہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جو حضرت پیر و مرشد نے غزل بھیج کر شرکائے مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہیں، بارگاہ جہاں پناہی میں ہمارا ناچیز شکریہ پیش کر کے ہماری عزت افزائی فرمائی جائے۔ مرزا فخرو نے خواص کی طرف دیکھا اس نے عرض کی قبلہ عالم! میں یہ پیام جاتے ہی پیش گاہ عالی میں پہنچا دوں گا۔ خواص آداب کر کے جانے والا ہی تھا کہ مرزا فخرو نے روکا اور کہا جانے سے پہلے صاحب عالم و عالمیان حضرت ولی عہد بہادر کی غزل بھی پڑھتے جاؤ چلتے چلتے مجھے عنایت کی تھی اور فرمایا تھا کہ کسی خوش گلو شخص سے پڑھوانا۔ بھلا تم سے زیادہ موزوں اور کون شخص مل سکتا ہے۔ یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر خواص کو دیا اس نے آداب کر کے کاغذ لیا اور وہیں بیٹھ کر یہ غزل سنائی۔

دل سے لطف و مہربانی اور ہے ۔۔۔ مہربانی کی نشانی اور ہے
قصہ فرہاد و مجنوں اور ہے ۔۔۔ عشق کی میرے کہانی اور ہے
رو گئے سے کب میرے رکتے ہیں اشک ۔۔۔ بلکہ ہوتی خون فشانی اور ہے
ہم سے اے داراؔ وہ کب ہوتے ہیں صاف ۔۔۔ ان کے دل میں بدگمانی اور ہے

غزل تو بہت پھسپھسی تھی، مگر ولیعہد بہادر کی غزل تھی بھلا کس کا جگرہ تھا جو تعریف نہ کرتا۔ البتہ غالب اور مومن بالکل چپ بیٹھے رہے، بعض قلعے والوں کو

برا بھی معلوم ہوا۔ مگر ان دونوں کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ سچی تعریف کرنے والے لوگ ہیں ولی عہد تو ولی عہد اگر بادشاہ سلامت کی بھی کمزور غزل ہو تو گردن تک نہ ہلائیں القصہ خواہی نخواہی غزل پڑھ کر رخصت ہوا۔ اور اب حاضرین جلسہ کے پڑھنے کی نوبت آئی۔

مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا اس نے دونوں شمعیں لا شامیانے کے سامنے رکھ دیں صاحب عالم نے اپنی غزل نکالی اور ادھر نظر ڈال کر اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا۔ بھلا کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کاملین فن کے مقابلے میں کچھ پڑھنے کا دعوی کروں البتہ جو کچھ برا بھلا کہا ہے وہ بہ نظر اصلاح عرض کرتا ہوں

غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا — درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا
حال کھل جائیں غیر کے سارے — پر کروں کیا کہ تو مرا نہ ہوا
درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر — بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا
وہ تو ملنا پر اے دل کم ظرف — تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا
شکوہ یار اور زبان رقیب — کھیل ٹھہرا کوئی گلہ نہ ہوا
تم رہو اور مجمع اغیار — میرا کیا ہے ہوا، ہوا نہ ہوا
پھر تمہارے ستم اٹھانے کو — رمز اچھا ہوا، برا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز تو اونچی نہ تھی۔ مگر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ سن کر دل قابو ہو جاتا تھا۔ سارا مشاعرہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے گونج رہا تھا تیسرے شعر پر مرزا غالب نے اور پانچویں پر حکیم مومن خاں نے ایسے جوش سے واہ واہ کی کہ صف سے آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو اپنی غزل پڑھتے رہے، مگر ان دونوں کو انہی دو شعروں کی رٹ لگی رہی۔ پڑھتے اور مزے میں آ کر جھومتے۔ جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشہ نے کہا سبحان اللہ! صاحب عالم سبحان اللہ۔ واہ کیا کہنا ہے، شعر یوں کہتے ہیں، مزہ آ گیا، استاد ذوق بھی مسکرائے کہ چلو اسی بہانے سے میری تعریف ہو رہی ہے مرزا فخرو نے

سلام کیا اور کہا۔ یہ آپ حضرت کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس کا ارشاد ہوتا ہے ورنہ من آنم کہ من دانم وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے اور وہ جھک جھک کر سلام کرتے۔ جب محفل میں ذرا سکون ہوا تو مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا اس نے شامیانے کے سامنے سے ایک شمع اٹھا سامنے کی صف میں میاں یل کے آگے رکھ دی نام تو ان کا عبدالقادر تھا۔ مگر شہر کا بچہ بچہ ان کو میاں یل کہتا تھا۔ ان کو بھی اپنی طاقت پر اتنا غرور[1] تھا کہ کسی پہلوان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے جس کو اکھاڑے میں جاتے وہاں خم ٹھونک آتے اور کسی کو جواب میں ان کے سامنے خم ٹھونکنے کی ہمت نہ ہوتی پہلوانی کی نسبت سے تخلص یل رکھا تھا۔ مضمون بھی رندانہ باندھتے تھے پڑھتے اس طرح

---

[1] اس غرور ہی نے آخر ان کو نیچا دکھایا، ان کا روز روز اکھاڑے میں آکر خم ٹھونکنا لوگوں کو ناگوار گزرا شیخو والوں کے استاد حاجی علی خاں نے ایک پٹھا تیار کیا بدن میں تو کچھ ایسا زیادہ نہ تھا۔ مگر داؤں پیچ میں طاق تھا، اور پھرتی اس بلا کی تھی کہ کیا کہوں ایک دن جو میاں یل نے حسب معمول شیخو والوں کے ہاں آکر خم ٹھونکے تو لونڈا کپڑے اتار برابر سامنے آگیا اور خم ٹھونک ہاتھ ملانا چاہا، میاں یل کو ہنسی آگئی بھلا یہ پودنا میرا کیا مقابلہ کرے گا۔ ہاتھ ملانے میں تامل کیا استاد علی جان نے کہا کیوں بھئی ہاتھ کیوں نہیں ملاتے یا تو ہاتھ ملاؤ یا پھر کبھی اس اکھاڑے میں آکر خم نہ ٹھونکنا، کہنے لگے استاد جوڑ تو دیکھ لو خواہ مخواہ اس لونڈے کو پسوانے سے حاصل استاد نے کہا، میاں جو جیسی کرے گا ویسی بھرے گا دنگل میں تم اسے کچل ڈالنا یہی ہو گا کہ ہڈی پسلی تڑوا کر آئندہ کو کان ہو جائیں گے بہرحال دونوں کے ہاتھ مل گئے اور تاریخ مقرر ہو گئی اس مشاعرے کے دو چار دن بعد شاہی دنگل میں کشتی قرار پائی عید گاہ کے پاس ہی یہ دنگل ہے دس پندرہ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے مگر اس روز وہاں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی جدھر نظر جاتی سر ہی سر دکھائی دیتے میاں یل کی بیہودگیوں کی وجہ سے ساری دہلی اس لونڈے کی طرف تھی۔ پہلے چھوٹی موٹی کشتیاں ہوتی رہیں۔ ٹھیک چار بجے یہ دونوں جانگئے پہن (باقی صفحہ ۱۷۷ پر)

تھے کہ گویا میدان کارزار میں رجز پڑھ رہے ہیں۔ اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی تعریف کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ ان کو اپنے شعر پڑھنے سے کام تھا۔ غزل لکھی تھی۔

کہہ دو رقیب سے کہ وہ باز آئے جنگ سے — ہرگز نہیں ہیں یار بھی کم اس دبنگ سے
لب کا بڑھا دیا ہے مزا خط سبز نے — ساقی نے پشت دی مے صافی کو بھنگ سے
دل اب کے بے طرح ہے پھنسا زلف یار میں — نکلے یہ کیونکر دیکھئے قید فرنگ سے
آجائیو نہ بیچ میں ظالم کے دیکھنا — یاری تو تم نے کی یل اس شوخ و شنگ سے

ان کی غزل ختم ہوتے ہی چوبدار نے دوسری شمع اٹھا مرزا علی بیگ کے سامنے رکھ دی یہ بڑے گورے نوجوان آدمی ہیں۔ کسرت کا بھی شوق ہے، نازنین تخلص کرتے ہیں، دہلی میں بس یہی ایک ریختی گو ہیں، ادھر شمع رکھی گئی، ادھر نواب زین العابدین خاں نے آواز دی "اوڑھنی لاؤ"۔ ایک نوکر فوراً گہرے سرخ رنگ کی تاروں بھری اوڑھنی لیکر حاضر ہوا۔ نازنین نے لیکر بڑے ناز و انداز سے اسکو اوڑھا۔ ایک پلو کا بکل مارا، دوسرا پلو سامنے پھیلا لیا۔ اور خاصی بھلی چنگی عورت معلوم ہونے لگے۔ غزل ایسی لڑلڑا کر اور اٹھا اٹھا کر پڑھی کہ سارا مشاعرہ عش عش کرنے لگا رت ایسا پیار کرتے تھے کہ کوئی بیسوا بھی کیا کرے گی دوسرا شعر تو اس طرح پڑھا کہ گویا "باجی" کو جلانے کیلئے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ قلعے والوں کو تو اس غزل میں بڑا مزا آیا مگر جو ریختے کے استاد

---

چادریں پھینک دنگل میں اترے۔ اترتے ہی دونوں نے "یا علی" کا نعرہ مارا دو چار ڈھلکیاں کھائیں کچھ مٹی پڑھ کر سینے پر ڈالی اور خم ٹھونک آمنے سامنے دونوں کے جسموں میں زمین آسمان کا فرق تھا، ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ تھا۔ تمام دنگل میں سناٹا تھا۔ سوئی بھی گرے تو آواز سن لو ہاں آواز تھی تو یا علی کی یا خم ٹھونکنے کی میاں بیل نے لونڈے کا ہاتھ پکڑ جھٹکا دیا وہ آگے کو جھکا یہ کمر پر آ گئے۔ وہ جھٹ غوطہ مار ہاتھوں کو چیر نکل گیا انھوں نے اسکا سیدھا ہاتھ پکڑ دھوبی پاٹ کسنا چاہا، وہ تو دھڑ کے الگ جا کھڑا ہوا۔ یہ گاؤزوری کر کے اسکو دبا تو لیتے لیکن وہ اپنی پھرتی کی وجہ سے ذرا سی دیر میں صاف نکل جاتا۔ آخر ایک دفعہ یہ اسکو دبا ہی بیٹھے وہ چپکا پڑا رہا انھوں نے بھی کس لئے تھوڑی دیر تک اسکو خوب رگڑا وہ سہے چلا گیا، انھوں نے پہلو میں اکسر اسکا سینہ کھولنا چاہا

(باقی صفحہ ۱۷۸ پر)

تھے وہ خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ غزل یہ تھی۔

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جواں تا کا | بڑا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا
مجھے کہتی ہیں باجی تو نے تاکا چھوٹے دیور کو | نہیں ڈرنے کی میں بھی ہاں نہیں ناکا تو اب تاکا
اگرائے ناز نیں تو دبلی پتلی کامنی سی ہے | چھریرا سا بدن، نام خدا ہے تیرے دولہا کا

اب دونوں شمعیں اس طرح گردش کرنے لگیں کہ پہلے صف کے سیدھے جانب کا ایک شخص غزل پڑھتا تھا اور پھر الٹی طرف کا ناز نین کے پڑھنے کے بعد داہنی جانب کی شمع ہٹ کر میاں عاشق کے سامنے آئی۔ یہ بیچارے ایک مزدور پیشہ آدمی ہیں۔ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے نہ کسی کے شاگرد ہیں نہ کسی کے استاد شعر خاصہ اچھا کہتے ہیں اس مشاعرہ میں ایک شعر ایسا نکل گیا ہے کہ سبحان اللہ کیا کہا ہے

فقط تو ہی نہ میرا اے بت خونخوار دشمن ہے | ترے کوچے میں اپنا ہر در و دیوار دشمن ہے

غزل میں باقی سارے اشعار تو صرف بھرتی کے تھے مگر اس شعر پر ہر طرف سے بڑی دیر تک واہ واہ ہوتی رہی، ان کے غزل ختم کرنے پر بائیں طرف کی شمع اٹھا کر عبداللہ خاں اوج کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ بڑے پرانے ۴۰، ۵۰ برس کے مشاق شاعر ہیں۔ مضمون کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں، لیکن ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایسے بلند مضامین اور نازک خیالات لاتے ہیں کہ ایک شعر تو کیا ایک قطعہ میں بھی انکی سمائی مشکل ہے اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ایک ہی شعر میں مضمون کو کھپا دیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا بھلا دوسروں کو تو انکے شعروں میں کیا مزا آئے اور کوئی کیا داد دے ہاں یہ خود ہی پڑھتے ہیں اور خود ہی مزے لیتے ہیں اور خود ہی اپنی تعریف کر لیتے

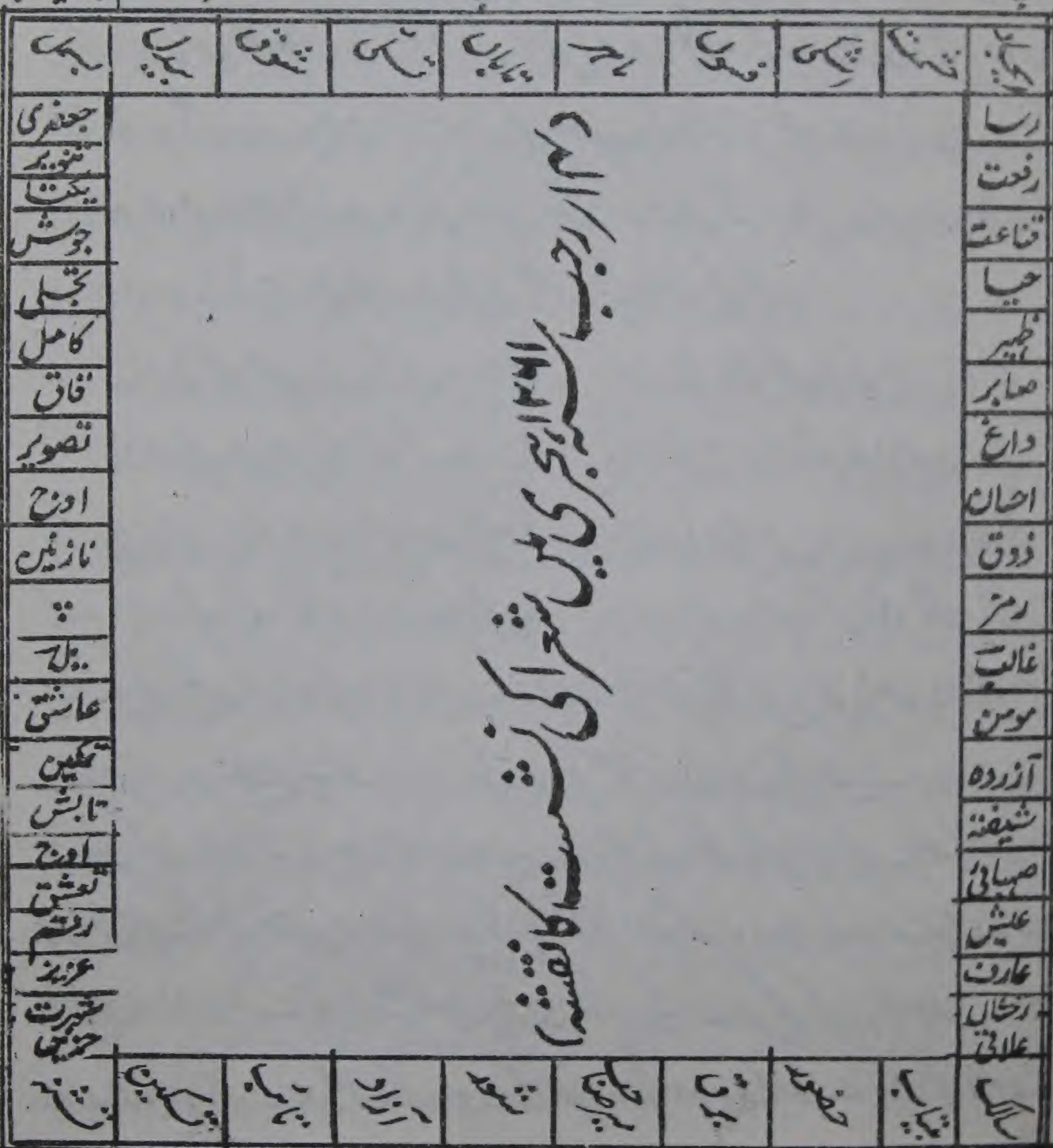
---

(بقیہ صفحہ ۱۷۷) وہ بھی موقعہ تاک رہا تھا۔ یہ کھینچنے میں ذرا غافل ہوئے اسنے ٹانگ پر باندھ جو اڑایا تو میاں بل چاروں شانے چت جا پڑے لونڈا اچک سینہ پر سوار ہو گیا، وہ مارا وہ مارا کی آوازوں سے دنگل ہل گیا، لوگوں نے دوڑ لونڈے کو گود میں اٹھا لیا۔ کسی نے یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ میاں بل کہاں پڑے، یہ بھی چپکے سے اٹھ چادر اوڑھ منہ لپیٹ ایسے غائب ہوئے کہ پھر کسی نے ان کی صورت نہ دیکھی دنگل سے کیا گئے ہمیشہ کیلئے دہلی سے گئے تھے بڑے غیرتمند وہ دن اور آج کا دن پھر ان کی صورت نظر نہ آئی خدا جانے کہاں مر کھپ گئے۔

ہیں۔ غزل اس زور شور سے پڑھتے ہیں کہ زور میں آکر صف مجلس سے گزوں آگے نکل جاتے ہیں ان کے شاگرد تو دو چار ہی ہیں مگر استاد بھی ان کو استاد مانتے ہیں۔ بھلا کس کا آج بوتہ ہے جو ان کو استاد نہ کہکر مفت کی لڑائی مول لے۔ ادھر انہوں نے شعر پڑھا ادھر استاد ذوق یا مرزا غالب نے داد دی۔ داد دینے میں ذرا دیر ہوئی اور ان کے تیور بدلے۔ انکے غصہ کی بھلا کون تاب لا سکتا ہے چار و ناچار تعریف کرنی پڑتی جب کہیں جا کر یہ ٹھنڈے پڑتے۔ غزل ہوئی تھی۔

دم کا جو دمدمہ یہ باندھے خیال اپنا ۔۔۔ بے پل صراط از بس، یہ ہے کمال اپنا

نیچے ایک نقشہ دیتا ہوں اس سے نشست کی کیفیت پڑھنے والوں کا سلسلہ اور مشاعرہ کا انتظام سمجھ میں آ جائیگا



طفلی ہی سے ہے مجھ کو وحشت سرا سے نفرت  سم میں گڑا ہوا ہے، آہو کے نال اپنا
کسب شہادت اپنا ہے یاد کس کو قاتل  سایچے میں تیغ کے سر لیتے ہیں ڈھال اپنا
جیجک کے آبلوں کی میں باگ موڑتا ہوں  درکھ کے، دیوی کے آستاں پر بیں ہلال اپنا

آخری شعر پر تو مرزا غالب اچھل پڑے، کہنے لگے واہ میاں اوج اس شعر کے دوسرے مصرعے نے تو غضب ڈھایا ہے، بھئی واللہ الفاظ "درکھ کے" کیا خوب پھنسائے ہیں یہ سب کافر ہیں جو تمہیں استاد کہتے ہیں، میاں تم تو شعر کے خدا ہو خدا۔ غرض سب ہی استادوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیئے اور میاں اوج ہیں کہ پھولکر کپا ہوئے جاتے ہیں، جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی طرف کی شمع کھسک کر محمد یوسف تمکین کے سامنے آئی انکی عمر ۱۵، ۱۶ سال کی ہوگی مدرسہ دہلی میں طالب علم ہیں غضب کی ظریفانہ طبیعت پائی ہے، بات کرنے میں منھ سے پھول جھڑتے ہیں نازک نازک نقشہ سانولا رنگ، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں جوان ہوں گے تو بڑے خوبصورت آدمی نکلیں گے یہ غزل کہی تھی۔

دوزخ بھی جس سے مانگتا ہر دم پناہ تھا  کس دل جلے کی بار خدایا یہ آہ تھی
خانہ خراب ہو جیو ترا عشق بے حیا  آئین کون سا تھا یہ کیا رسم وراہ تھی
تو نے جو دل کو میرے صنم خانہ کردیا  رہنا خدا تھا جس میں یہ وہ بارگاہ تھی
تمکین کو اک نگاہ میں دیوانہ کردیا  جادو فریب آہ یہ کس کی نگاہ تھی

میاں تمکین کا دل بڑھانے کو سب نے تعریف کی قطعہ کو کئی کئی دفعہ پڑھوایا استاد احسان نے کہا میاں یوسف! کیا کہنا، خوب کہتے ہو۔ کوشش کئے جاؤ ایک نہ ایک دن استاد ہو جاؤ گے مگر میاں کسی کے شاگرد ہو جاؤ بے استادے رہے تو بھٹک نکلوگے میاں تمکین نے مسکرا کر کہا استاد! میں کہیں آپ کے حکم سے باہر ہو سکتا ہوں کل ہی انشاء اللہ استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں، استاد ذوق نے کہا ہاں بھئی، ہاں خوب انتخاب کیا۔ بس یہ سمجھو کہ چند ہی دن میں بیڑا پار ہے، یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ دوسری شمع غلام احمد تصویر کے سامنے پہنچ گئی۔ ان کو

میاں بن بھی کہتے ہیں۔ الف کے نام بے نہیں جانتے، مگر طبیعت غضب کی پائی ہے، پہلے میاں تنویر کے شاگرد تھے۔ بعد میں ان سے ٹوٹ کر استاد ذوق سے آملے۔ بھاری بدن منڈی ہوئی داڑھی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ گہرا سانولا رنگ جسم پر سوسی کا تنگ مہری کا پیجامہ اور سوسی ہی کا کرتہ۔ کندھے پر لٹھے کا رومال، سر پر سوزنی کے کام کی گول ٹوپی بیچارے بنجہ بندی پر گذر اوقات کرتے ہیں بڑے پُر گو شاعر ہیں لکھنا پڑھنا تو جانتے ہی نہیں اس لئے جو کچھ کہتے دل و دماغ میں ٹھونستے جاتے ہیں۔ یاد اس بلا کی ہے کہ ذرا چھیڑ دو توار گن کی طرح بجنے لگتے ہیں اور ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کلام ایسا پاکیزہ ہے کہ بڑے بڑے استادوں کے سر ہل جاتے ہیں ان کو سنو تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایک امی پڑھ رہا ہے۔ بس یہ سمجھ لو۔ الشعراء تلامیذالرحمٰن کی بہترین مثال ہیں غزل کہی تھی۔

ہجر کی شب تو سحر ہو یارب　　وہ نہ آیا تو قیامت ہی سہی

جان بیکار تو اپنی نہ گئی　　اے ستمگر تری شہرت ہی سہی

مجھ سے اتنا بھی نہ کھنچیئے صاحب　　آپ پر میری طبیعت ہی سہی

جذبۂ دل نہیں لایا تم کو　　آپ کی خیر عنایت ہی سہی

ہر شعر پر واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے محفل گونج جاتی تھی۔ غزل تمام ہوئی تو استاد ذوق نے حکیم مومن خاں کی طرف دیکھ کر کہا۔ خاں صاحب یہ میاں بن بھی غضب کی طبیعت لیکر آئے ہیں۔ کہنے کو تو میرے شاگرد ہیں۔ مگر اب تک ان کے کسی شعر میں اصلاح دینے کی مجھے تو ضرورت نہیں ہوئی، کل ایک غزل سنائی تھی۔ میں تو پھڑک گیا ایک شعر تو ایسا بے ساختہ نکل گیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہاں میاں بن وہ کیا شعر تھا۔ میاں بن نے ذرا دماغ پر زور ڈالا اور شعر دماغ سے پھسل زبان پر آگیا۔ مطلع تھا۔

برچھی تری نگاہ کی پہلو میں آگئی　　پہلو سے دل میں، دل سے کلیجہ میں جا لگی

اور یہ شعر تھا

دامن پہ وہ رکھے نہ رکھے دل ربا لگی لیکن ہماری خاک ٹھکانے سے آ لگی

حکیم صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا۔ میاں بن یہ! یہ خدا کی دین ہے یہ بات پڑھنے پڑھانے سے پیدا نہیں ہوتی۔ میاں خوش رہو اس وقت دل خوش کر دیا۔

ان کے بعد شمع محمد جعفر ناطق کے سامنے آئی۔ یہ الہ آباد کے رہنے والے ہیں بہت دنوں سے دلی میں آرہے ہیں۔ بیچارے گوشہ نشین آدمی ہیں شاعری سے دلی لگاؤ ہے۔ ان کوئی مشاعرہ نہیں ہوتا۔ جہاں نہ پہنچتے ہوں، غزل میں دو شعر بہت اچھے تھے وہی لکھتا ہوں

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے تو یہ کچھ ہم کو ساز گار نہیں

دل میں خوش ہیں عدو، برائے ناطق وہ ستمگر کسی کا یار نہیں

مقطع کی کچھ ایسی پیاری بندش پڑی ہے کہ سب کے منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکلی مفتی صدرالدین صاحب کی تو یہ حالت تھی کہ پڑھتے تھے اور جھومتے تھے۔

ناطق کے بعد الٹی جانب کی شمع میاں قلق کے آگے گئی، خدا ان سے محفوظ رکھے۔ بڑے چالاک آدمی ہیں، عبدالعلی نام ہے۔ مدراس کے رہنے والے ہیں، کوئی ۳۰ برس کی عمر ہے۔ بچپن ہی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے، حیدرآباد ہوتے ہوئے دہلی آئے ہزاروں کو تعویذوں کے جال میں پھنسا کر مشغلہ ہی کر دیا۔ ان کی شکل سے لوگ گھبراتے ہیں، شاہ صاحب بنے پھرتے ہیں، مگر دل کا خدا مالک ہے۔ شعر خاصہ کہتے ہیں لکھا تھا۔

خم شراب سے خم گردوں تو بن گیا ساقی بنادے ماہ پیالہ اچھال کے

ہم مشربوں میں چل کے قلق میکشی کرو جھگڑے وہاں نہیں ہیں حرام و حلال کے

یہ پڑھ چکے تو شمع منشی محمود جان اوج کے سامنے آگئی۔ ان کی غزل میں دو ہی شعر ایسے تھے جن کی تھوڑی بہت تعریف ہوئی باقی کے تو سب بھرتی کے تھے۔

---

۱؎ آئندہ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ سیدھی طرف کی شمع بڑھی یا الٹی جانب سے بس یہ سمجھ لیجیے کہ پہلے دائیں طرف کا ایک شاعر پڑھتا تھا اور پھر بائیں طرف کا۔

آنے میں اس جان جاں کے دیر ہے کچھ مقدر کا ہمارے پھیر ہے
ہے یقیں وہ جان جاں آتا نہیں موت کے آنے میں پھر کیوں دیر ہے

ان کے بعد مرزا کامل بیگ کی باری آئی یہ سپاہی پیشہ آدمی ہیں، کامل تخلص کرتے ہیں مشاعرے میں بھی وہاں سپاہیانہ رنگ جھلک رہا ہے، ان کی غزل میں قطعہ بڑے مزے کا تھا وہی لکھتا ہوں۔

مژگاں سے گر بچے دل، ابرو کرے ہے ٹکڑے یہ بات میں نے کہہ کر جب اس سے داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہوئے خالی تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

اب حکیم سید محمد تعشق کے پڑھنے کا نمبر آیا۔ یہ بڑے پایہ کے ادیب ۶۳، ۶۴ برس کی عمر ہے حکمت میں اپنا جواب نہیں رکھتے غرض کیا کہوں ایک جامع کمالات شخص ہیں مگر اپنے آپ کو بہت دور کھینچتے ہیں۔ اچھا شعر سنتے ہیں تو بیتاب ہو جاتے ہیں چاہتے ہیں کہ جس طرح میں تعریف کرتا ہوں۔ اسی طرح دوسرے بھی میرے شعر کی تعریف کریں۔ شعر برا نہیں کہتے۔ مگر ایسا بھی نہیں ہوتا کہ مشاعرہ چمک اٹھے اور ہر شخص کے منھ سے بیساختہ واہ واہ نکل جائے۔ اب خود ہی ان کا کلام دیکھ لیجئے۔

تجھ کو اس میری آہ وزاری پر رحم اے فتنہ گر نہیں آتا
وعدہ شام تو کیا لیکن پھر وہ آتا نظر نہیں آتا
تیرے بیمار کا ہے یہ عالم ہوش دو دو پہر نہیں آتا

تعریف تو ہوئی۔ مگر کچھ ان کے دل کو نہ لگی۔ اس لئے ذرا آزردہ سے ہو گئے۔ ان کے بعد شمع میر حسین تجلی کے سامنے آئی۔ یہ میر تقی میر کے پوتے ہیں۔ بڑے ظریف اور نکتہ سنج آدمی ہیں، کلام میں وہی میر صاحب کا رنگ جھلکتا ہے۔ زبان پر جان دیتے ہیں، غزل تو چھوٹی سی ہوتی ہے، مگر جو کچھ کہتے ہیں اچھا کہتے ہیں، کیوں نہ ہو آخر کس کے پوتے ہیں۔

میری وفا پہ تجھے رشک تھا اے ظالم
یہ سر، یہ تیغ ہے، لے اب تو اعتبار آیا
بہ شوق دیکھو پس مرگ بھی تجلی نے
کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

میاں تجلی پڑھ چکے تو حکیم سکھانند رقم کی باری آئی۔ ان کو میں حکیم مومن خاں صاحب کے مکان پر دیکھ چکا تھا۔ کلام تو ایسا اچھا نہیں ہوتا۔ مگر پڑھتے خوب ہیں جہاں کسی نے ذرا بھی تعریف کی انہوں نے سلام کا تار باندھ دیا غزل لکھی تھی۔

بجھانا آتش دل کا بھی کچھ حقیقت ہے
ذرا سا کام تجھے چشم تر نہیں آتا
عدم سے کوچہ قاتل کی راہ ملحق ہے
گیا ادھر جو گزر پھر ادھر نہیں آتا
ہو خاک چارہ گری اس مریض کی تیرے
نظر میں تجھ سا کوئی چارہ گر نہیں آتا

تیسرا شعر حکیم مومن خاں صاحب کے رنگ کا تھا اس کی انہوں نے بہت تعریف کی مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا۔ میاں رقم! یا تو تم حکمت ہی کرو یا شعر ہی کہو۔ ان دونوں چیزوں کا ملا کر چلانا ذرا مشکل کام ہے۔

شمع کا شیخ نیاز احمد جوش کے سامنے جانا تھا۔ کہ شاگردان ذوق ذرا سنبھل بیٹھے جوش کو استاد ذوق بہت عزیز رکھتے ہیں ان کی عمر تو ۱۸ - ۱۹ سال کی ہے مگر بلا کے طباع اور ذہین ہیں۔ ان کی سخن گوئی اور سخن فہمی کی قلعے بھر میں دھوم ہے مگر مشاعرے میں انہوں نے جو غزل پڑھی وہ تو مجھے کچھ پسند نہ آئی ہاں قلعے والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پر اٹھا لیا۔ استاد ذوق نے بھی سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ کر شاگرد کا دل بڑھایا۔ غزل دیکھ لیجیے ممکن ہے کہ میں نے غلط اندازہ لگا لیا ہو۔

کیونکر وہ ہاتھ آئے کہ یاں زور و زر نہیں
لے دے کے ہے اک آہ سو اس میں اثر نہیں
قسمت سے درد بھی تو ہوا وہ ہمیں نصیب
جس درد کا کہ چارہ نہیں، چارہ گر نہیں
قسمت ہی میں نہیں ہے شہادت وگرنہ یاں
وہ زخم کون سا ہے کہ جو کارگر نہیں
سجدے میں کیوں پڑا ہے ارے اٹھ شراب پی
اے جوش میکدہ ہے خدا کا یہ گھر نہیں

آپ نے غزل ملاحظہ کرلی، میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ کوئی شعر بھی ایسا نہیں ہے جو تعریف کے قابل ہو۔ اب زبردستی کی تعریفیں کرنا دوسری بات ہے۔

ان کے بعد مولوی امام بخش صہبائی کے بڑے فرزند محمد عبدالعزیز کا نمبر آیا۔ یہ عزیز تخلص کرتے ہیں غزل خوب کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو بڑے باپ کے بیٹے ہیں، ہائے کیا شعر نکالے ہیں، لکھتے ہیں۔

جوں شمع شغل تیرے سراپا نیاز کا — جلنا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا
کج فہمیوں سے خلق کی دیکھا کہ کیا ہوا — منصور کو حریف نہ ہونا تھا راز کا
ہم عاصیوں کا بارِ گنہ سے جھکا ہے سر — اور خلق کو گمان ہے ہم پر نماز کا
مغرور تھا ہی اور وہ مغرور ہو گیا — اس میں گلہ نہیں مجھے آئینہ ساز کا
اوروں کے ساتھ لطف سے تھا صورتِ نیاز — یاں بڑھ گیا دماغ تغافل سے ناز کا

ذرا سچ کہیئے گا، ساری کی ساری غزل مرصع ہے یا نہیں۔ ہاں اس غزل کی جو کچھ تعریف ہوئی وہ بجا ہوئی۔ استاد ذوق نے بھی کہا بھئی صہبائی تمہارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے۔ خدا اس کی عمر میں برکت دے، ایک دن بڑا نام پیدا کرے گا واہ میاں صاحبزادے واہ کیا کہنا ہے! دل خوش ہو گیا۔ کیوں نہ ہو ایسوں کے ایسے ہوتے ہیں میاں عزیز نے اٹھ کر سلام کیا اور بیٹھ گئے۔

میاں عزیز کے بعد شمع خواجہ معین الدین یکتا کے سامنے آئی۔ ان کا کیا کہنا سرکار سے خطاب خانی پایا ہے کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ کبھی کسی کے شاگرد ہوتے ہیں کبھی کسی کے۔ پہلے احسان سے تلمذ تھا آج کل مرزا غالب کی طرف ڈھلک گئے ہیں۔ ایسے متلون مزاجوں کو نہ کبھی کچھ کہنا آیا ہے نہ آئیگا۔ میرا بڑا دل خوش ہوا کہ کسی نے تعریف نہیں کی، بڑے چلے ہوں گے بھلا ایسے شعروں کی کوئی خاک تعریف کرے۔

اے آہ شعلہ زا یہ خس و خار بھی نہیں — نو آسمان ہیں دو بھی نہیں چار بھی نہیں

ہے کس کو تاب شکوہ دشمن کہ ضعف سے لب پر ہمارے تذکرہ یار بھی نہیں
جلنا فراق یار میں وعدہ کی لاگ پر آسان گر نہیں ہے تو دشوار بھی نہیں

ہاں اب جس کے سامنے شمع آئی ہے وہ شاعر ہے۔ یہ کون ہیں مرزا حاجی بیگ شہرت۔ گورا رنگ میانہ قد، کوئی ۳۰، ۳۲ برس کی عمر بڑے بنے سنورے رہتے ہیں۔ پہلے انہی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ اب کچھ تھوڑے دنوں سے بند ہے مفتی صدرالدین صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔ کہتے بھی خوب ہیں اور بڑی پاٹدار آواز ہے، پڑھنے کا ڈھنگ ایسا ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اترتا جاتا ہے ہر شعر پر تعریفیں ہوئیں اور کیوں نہ ہوتیں ہر شعر تعریف کے قابل تھا غزل یہ ہے۔

ایک دن دو دن کہاں تک تو بھی کچھ انصاف کر یہ تو جلنا روز کا اے سوز ہجراں ہو گیا
ہے ترقی جو ہر قابل ہی کے شایاں کہ میں خاک کا پتلا بنا پتلے سے انسان ہو گیا
کفر دیں میں تھا نہ کچھ عقیدہ بجز بند نقاب اس کے کھلتے ہی یہ کار مشکل آسان ہو گیا
پہلے دعوائے خدائی اس بت کافر کو تھا کچھ درستی پر جو آج آیا تو انسان ہو گیا

آخری شعر پر تو مرزا غالب کی یہ حالت تھی کہ گویا بالکل مست ہو گئے ہیں رانوں پر ہاتھ مارتے اور کہتے۔ واہ میاں شہرت واہ! کمال کر دیا۔ شعر کیا ہے اعجاز ہے یہ ایک شعر بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے، ہاں کیا کہا ہے۔ سبحان اللہ! پہلے دعوائے خدائی اس بت کافر کو تھا۔ کچھ درستی پر جو آج آیا تو انسان ہو گیا۔ غرض اس شعر نے ایک کیفیت محفل میں پیدا کر دی تھی، لوگ خود پڑھتے، ایک دوسرے کو سناتے، مزے لے لیکر جھومتے اور جوش واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے مارتے بڑی دیر میں جا کر محفل میں ذرا سکون ہوا تو شمع نوازش حسین خاں تنویر کے سامنے گئی یہ نوجوان آدمی ہیں کوئی ۳۲-۳۳ برس کے ہوں گے بادشاہ سلامت ان کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ میاں شہرت کے شعر نے وہ جوش پیدا کر دیا تھا۔ کہ ان کی غزل کسی نے

بھی غور سے نہیں سنی غزل بھی معمولی تھی صرف قطعہ خاصہ تھا

کہتا لوگوں سے بظاہر بت عیار ہے کیا | جان کر دل میں مجھے اپنا مریض تپ غم
پوچھنا اس سے کہ اس شخص کو آزار ہے کیا | رنگ رخ زرد ہے، تر چشم ہے لب پر دم سرد

یہ پڑھ چکے تو شمع میر بہادر علی حزیں کے سامنے رکھی گئی۔ یہ بڑے سنجیدہ متین اور وضع دار آدمی ہیں۔ عارف کے شاگرد ہیں، ان کا ایک شعر بڑے مزے کا ہے۔

کہ بھرے خم سے مے شیشے میں اور شیشے سے ساغر میں | سبو سے منھ لگائیں گے اب اتنا صبر ہے کس کو

جو غزل انہوں نے اس روز مشاعرہ میں پڑھی تھی اس کے یہ دو تین شعر اچھے تھے

اللہ ری وسعتیں تری اے تنگنائے دل | دنیا کی وسعتیں ترے گوشے میں آگئیں
اک داغ رہ گیا مرے پہلو میں جلائے دل | جل جل کے آخرش تپش غم کے ہاتھ سے
اور دیکھئے حزیں ابھی کیا کیا دکھلائے دل | دیکھا وہ اپنی آنکھ سے جو کچھ سنا نہ تھا

مقطع کو سب نے پسند کیا اور واقعی ہے بھی اچھا۔

ان کے بعد شمع ایسے شخص کے سامنے آئی جو خود شاعر، جس کا باپ شاعر جس کا سارا خاندان شاعر، وہ کون؟ میاں باقر علی جعفری، فخر الشعرا، نظام الدین ممنون کے چھوٹے بھائی، ملک الشعرا قمر الدین منت کے چھوٹے بیٹے۔ ان کی غزل میں زور نہ ہوگا تو اور کس کی غزل میں ہوگا۔ غزل تھی۔

تیغ یوں دل میں خیال نگہ یار نہ کھینچ | ناخدا ترس تو کعبہ میں تو تلوار نہ کھینچ
بے سر و پا چمن و دشت میں عالم کے نہ پھر | ناز ہر گل نہ اٹھا منت ہر خار نہ کھینچ

غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف نہ ہوئی، وجہ یہ ہے کہ یہ رنگ اب دہلی سے اٹھتا جاتا ہے۔ اب تو روزمرہ پر لوگ جان دیتے ہیں، اس پر اگر مضمون پیدا ہو گیا تو سبحان اللہ مرزا غالب اس رنگ کے بڑے دلدادہ تھے۔ وہ بھی اس کو اب چھوڑتے جاتے ہیں۔

اس کے بعد منشی محمد علی تشنہ کے پڑھنے کی باری تھی، چوبداران کے سامنے شمع رکھنے میں ذرا ہچکچایا یہ ننگ دھڑنگ مزے میں دوزانو بیٹھے جھوم رہے تھے چوبدار نے مرزا فخرو کی طرف دیکھا انھوں نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ رکھ دے اس نے رکھ دی جب شمع کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو میاں تشنہ نے بھی آنکھیں کھولیں کچھ سمجھ کر پھونک مار شمع گل کر دی اور کہا میں بھی کچھ عرض کروں۔ سب نے کہا ضرور فرمایئے انھوں نے نہایت آزادانہ لہجے میں کچھ گاتے ہوئے کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سنائی۔

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے — سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں
شمع ہے گل بھی ہے بلبل بھی ہے پروانہ بھی — رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں
حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے — فتنہ ہے ایک تیری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں
نیستی کی ہے مجھے کوچہ ہستی میں تلاش — سیر کرتا ہوں ادھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں
ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ — فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں کہ اس غزل کا کیا اثر ہوا۔ ایک سناٹا تھا کہ زمین سے آسمان تک چھایا ہوا تھا۔ غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ادھر یہ عالم طاری تھا، ادھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے اور "کچھ بھی نہیں" کہتے ہوئے اٹھے اور اسی عالم بیخودی میں، دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کی "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔ ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منھ سے بے اختیار یہی نکلا کہ "واقعی کچھ بھی نہیں۔"

مرزا فخرو نے شمع منگا کر روشن کی اور کہا، ہاں صاحب پھر شروع کیجیے۔ شمع حافظ محمد حسین بسمل کے سامنے رکھی گئی بھلا تشنہ کے بعد ان کا کیا رنگ جمتا۔ اول تو یہ نومشق ہیں مرزا قادر بخش صابر سے اصلاح لیتے ہیں، دوسرے غزل میں بھی کوئی

خاص بات نہ تھی البتہ مقطع اچھا تھا۔ غزل ملاحظہ ہو۔

دل تو نے ہم سے اوبت کا فر اٹھا لیا — اس ناز کی پہ بوجھ یہ کیونکر اٹھا لیا
بار گرانِ عشق فلک سے نہ اٹھ سکا — کیا جانے میرے دل نے یہ کیونکر اٹھا لیا
پیر مغاں نے بسمل سکش کو دیکھ کر — شیشہ بغل میں ہاتھ میں ساغر اٹھا لیا

بہر حال کسی نے سنا کسی نے نہ سنا، کچھ تھوڑی بہت تعریف بھی ہوئی اور شمع میر حسین تسکین کے پاس پہنچ گئی۔ ان کی عمر کوئی ۴۰ برس کی ہوگی، صہبائی کے شاگرد ہیں، مومن سے بھی اصلاح لی ہے ان کا خاندان دہلی میں بہت مشہور ہے، انہی کے دادا امیر حیدر نے میر حسین علی وزیر فرخ سیر کو مارا تھا، سپاہی پیشہ آدمی ہیں شعر بھی برا نہیں کہتے لکھا تھا۔

ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلی دل — کسی کے جانے سے گو خود نہیں قرار مجھے
شب وصال میں سننا پڑا فسانہ غیر — سمجھتے کاش وہ اپنا نہ راز دار مجھے
وہ اپنے وعدے پہ محشر میں جلوہ فرمائیں — نہیں ہے ضعف سے انبوہ میں گذار مجھے
مرے قصور سے دیدار میں ہوئی تاخیر — نہ دیکھنا تھا تماشائے روزگار مجھے
مزے یہ دیکھے ہیں آغازِ عشق میں تسکین — کہ سوجھتا نہیں اپنا مآل کار مجھے

غرض اس غزل نے مشاعرے کا رنگ پھر درست کر دیا اور لوگ ذرا سنبھل کر ہو بیٹھے استاد احسان کے شاگرد خواجہ غلام حسین بیدل کے سامنے شمع آئی انہوں نے یہ غزل پڑھی۔

نگہ کی چشم کی، زلفِ دوتا کی — سہے اک دل جفا کس کس بلا کی
کب اس گل کی گلی تک جاسکے ہے — ہوا باندھی ہے یاروں نے ہوا کی
بتوں سے ملتے ہو راتوں کو بیدل — تمہیں بھی دن لگے قدرت خدا کی

ساری کی ساری غزل پھسپھسی تھی، بھلا اس کی کون تعریف کرتا، ہاں اسکے بعد جو

غزل محمد حسین صاحب تائب نے پڑھی اس میں مزہ آگیا۔ میاں تائب مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بھتیجے ہیں اور فخر الشعرا نظام الدین ممنون کے شاگرد چھوٹی بحر میں ایسی غزل لکھتے ہیں کہ سبحان اللہ اور پڑھنا تو ایسا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی غزل تھی۔

پھر کناں دار جب گریباں چاک ہوا　　پھر کوئی ماہ لقا یاد آیا
کہیے اس بت کو مشابہ کس کے　　دیکھ کر جس کو خدا یاد آیا
عہدِ پیری میں جوانی کی امنگ　　آہ کس وقت میں کیا یاد آیا

دوسرے اور تیسرے شعر پر تو یہ حال تھا کہ لوگ تعریفیں کرتے کرتے اور میاں تائب سلام کرتے کرتے تھک جاتے تھے جب ذرا جوش کم ہوا تو شمع استاد ذوق کے استاد غلام رسول شوق کے سامنے آئی، بیچارے بڈھے آدمی ہیں۔ شاہ نصیر کے شاگرد ہیں۔ مسجد عزیز آبادی میں امامت کرتے ہیں۔ شروع شروع استاد ذوق نے ان کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ اسی برتے پر یہ اپنے آپ کو ان کا استاد کہا کرتے ہیں اور اب بھی چاہتے ہیں کہ ذوق اسی طرح آکر مجھ سے اصلاح لیا کریں۔ مجھے تو کچھ سٹھیائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ غزل جو پڑھی تو واقعی اس کا مطلع بڑے زور کا تھا۔ باقی الحمدللہ خیر سلا۔

لکھا ہوا ہے یہ اس مہ جبیں کے پردے پر
نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردے پر

استاد ذوق کے چھیڑنے کو غالب، مومن، آزردہ، صہبائی، غرض جتنے استادان فن تھے سب نے میاں شوق کی بڑی واہ واہ کی اور انہوں نے ذوق کی طرف دیکھ کر کہا۔ دیکھا شعر یوں کہتے ہیں، وہ بیچارے ہنس کر خاموش ہو جاتے، ان کے ایک، آدھ شاگرد نے جواب دینا بھی چاہا۔ مگر انہوں نے روک دیا۔

خدا خدا کر کے ان سے فراغت ہوئی تو شمع آزاد کے سامنے آئی - ان کا نام الگزنڈر ہیڈلے ہے، قوم کے فرانسیسی ہیں، دہلی میں پیدا ہوئے، یہیں تربیت پائی اور یہیں سے توپ خانے کے کپتان ہوکر الور گئے، کوئی ۲۱ سال کی عمر ہے ڈاکٹری بھی جانتے ہیں۔ شعر و سخن کا بہت شوق ہے عارف کے شاگرد ہیں جہاں مشاعرے کی خبر سنی اور دہلی میں آموجود ہوئے۔ لباس تو وہی فوجی ہے - مگر بات چیت اردو میں کرتے ہیں، ایسی صاف اردو بولتے ہیں۔ جیسے کوئی دہلی والا بول رہا ہے۔ شعر بھی کچھ برے نہیں ہوتے - ایک فرانسیسی کا اردو میں ایسے شعر کہنا واقعی کمال ہے۔ غزل ملاحظہ ہو۔

وہ گرم رو راہ معاصی ہوں جہاں میں — گرمی سے رہا نام نہ دامن میں تری کا
کچھ پاؤں میں طاقت ہو تو کر دشت نوردی — ہاتھوں سے مزا دیکھ ذرا جیب دری کا
جہلم کو عبادت کے لئے وہ مرے آئے — آزاد ٹھکانا بھی ہے اس بے خبری کا

آزاد کے بعد شمع دوسری طرف میر شجاعت علی تسلی کے پاس آئی، بیچارے غریب صورت فرسودہ لباس کوئی ۶۴ - ۶۵ برس کے آدمی ہیں۔ شاہ نصیر کے بڑے چاہتے شاگردوں میں تھے۔ اپنے زمانے کے جراُت سمجھے جاتے تھے اب بہت دنوں سے دنیا سے کنارہ کشی کر کے قدم شریف میں جا رہے ہیں، مشاعرے کی کشش کبھی کبھی ان کو دہلی کھینچ لاتی ہے، پڑھنے کا انداز بھی نرالا ہے اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہو۔ غزل دیکھ لیجئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق میں سوال و جواب ہو رہے ہیں۔

کیسی ٹھوکر جڑی ہے حضرت دل — پاؤں پر اس کے سر دھرو تو سہی
جب کہا میں نے تم پہ مرتا ہوں ق — تم گلے سے مرے لگو تو سہی
بولے وہ کیا مزے کی باتیں ہیں — خیر ہے کچھ پرے ہٹو تو سہی

غیر کے کل دلگ کے چھاتی سے ق مجھ سے کہنے لگے، سنو تو سہی
اس لیے اس کے ہم گلے سے لگے کہ ذرا جی ہیں تم جلو تو سہی

اس غزل کی جیسی تعریف ہونی چاہیے تھی ویسی نہیں ہوئی کیونکہ اب وہ وقت آگیا تھا کہ نیند کے خمار سے سر میں چکر آنے لگے تھے اور برے بھلے کی تمیز دشوار ہو گئی تھی۔ اس کے بعد جو ایک دو غزلیں ہوئیں وہ بس ہوگئیں نہ کسی نے شوق سے سنا اور نہ مزہ آیا۔

میاں تسلی کے بعد شور نے غزل پڑھی۔ یہ کوئل کے رہنے والے ہیں، قوم کے عیسائی ہیں، اور نام جارج پیس ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد ہیں یہاں اکثر دہلی آتے جاتے رہتے ہیں، جو کچھ کہہ لیتے ہیں بہت غنیمت ہے۔ غزل

عاجز تھا ہی جان سے ایسا تڑا مریض دیکھنے سے جس کے حالت عیسیٰ تباہ تھی
بل بے یہ بیخودی کہ خودی سے بھلا دیا ورنہ یہ زیست مرگ کی اپنے گواہ تھی
دیر و حرم میں تو نہ دے ترجیح زاہدا جس سمت سے سر جھکا وہی بس سجدہ گاہ تھی

اس کے بعد محمد عسکری نالاں کی باری آئی بھلا اس نوے برس کے بڈھے کی آواز نیند کے خمار میں کسی کو کیا سنائی دیتی۔ مصحفی کے سب سے پہلے شاگرد ہیں اب تو ان کو بس تبرک سمجھ لو۔ شعر بھی وہی باوا آدم کے وقت کے کہتے ہیں۔

سحر کے ہونے کا دل کو خیال رہتا ہے شب وصال بھی دل کو ملال رہتا ہے
وہ بدگماں ہو کہ اس بت کے سایہ پر بھی مجھے رقیب کا ہی سدا احتمال رہتا ہے

میاں نالاں نے پڑھنا ختم ہی کیا تھا کہ شمع میر صاحب کے سامنے پہنچ گئی۔ شمع کا پہنچنا ہی تھا کہ، ہر شخص سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بعض نے انگلیوں سے آنکھیں مل ڈالیں۔ بعض نے کرتے کے دامن سے رگڑیں۔ بعض نے اٹھ اور پانی کا چھینٹا منہ پر مار آ بیٹھا کیسی نیند اور کہاں کا سونا میر صاحب کے نام نے سب کو چاق چوبند کر دیا مرزا فخرد

اب تک ایک پہلو پر بیٹھے تھے انہوں نے بھی پہلو بدلا۔ استادان فن کے چہروں پر مسکراہٹ آئی، نوجوانوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ میر صاحب بھی صف سے کچھ آگے نکل آئے مرزا فخرو نے کہا، میر صاحب یہ ٹھیک نہیں۔ آپ تو بیچ میں آکر پڑھئے، یہ کہکر چوبدار کو اشارہ کیا اس نے دونوں شمعیں اٹھا وسط صحن میں رکھ دیں۔ میر صاحب بھی اپنی جگہ سے اٹھ شامیانے کے عین سامنے آ بیٹھے بھلا دہلی میں کون ہے جو میر صاحب کو نہیں جانتا کون سا مشاعرہ ہے، جو ان کی وجہ سے چمک نہیں اٹھتا، کون سی محفل ہے جہاں ان کے قدم کی برکت سے رونق نہیں آجاتی ان کا نام تو شاید گنتی کے چند آدمی جانتے ہوں ہم نے تو جب سنا ان کا نام میر صاحب ہی سنا، کوئی ستر برس کی عمر ہے بڑے سوکھے سہمے آدمی ہیں غلافی آنکھیں، طوطے کی چونچ جیسی ناک، بڑا دہانہ، لمبی داڑھی بٹیا سا سر، خشخاشی بال، گوری رنگت اونچا قد، غرض ان کے حلیئے کو دہلی کے کسی بچے سے بھی پوچھیے تو پورا پورا بتا دے۔ نہایت صاف ستھرا لباس سفید ایک برکا پیجامہ، سفید کرتہ، اس پر سفید انگرکھا، سر پر ارخ چین (عرق چین) ٹوپی چہرے پر متانت بلا کی تھی مگر جب غصہ آتا تو کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتے تھے، چھوٹا ہو یا بڑا۔ کوئی ان سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا تھا اور یہ بھی تڑسے وہ جواب دیتے تھے کہ منہ بھر جائے۔ اس سے ان کو غرض نہ تھی کہ جواب ہو بھی گیا یا نہیں، مشاعرے میں میاں تمکین سے لیکر بادشاہ سلامت تک ان کو چھیڑتے تھے۔ انہوں نے نہ ان کا برا مانا نہ ان کا جواب دینے میں ان سے رکے نہ ان سے غزل ہمیشہ فی البدیہہ پڑھتے تھے۔ لکھ کر لانے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کی غزل میں مصرعوں کے توازن کی ضرورت ہی نہ تھی۔ صرف قافیہ اور ردیف سے کام تھا۔ جو کچھ کہنا ہوا نہایت اطمینان سے نثر میں بیان کرنا شروع کیا۔ بیچ میں دوسروں کے اعتراضوں کا جواب بھی دیتے رہے، جب کہتے کہتے تھک گئے تو ردیف اور قافیہ لا شعر کو ختم کیا۔ انہوں نے شعر پڑھنا شروع کیا اور چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھار ہوگئی۔ یہ بھلا کب دبنے والے

اسامی ہیں جو لکھا لڑتے جب زبان سے نہ دبا سکتے تو زور میں آکر کھڑے ہو جاتے۔ یہ کھڑے ہوئے اور کسی نہ کسی نے ان کو بٹھا دیا، معترض کو ڈانٹا۔ میر صاحب کا دل بڑھا، اور پھر وہی اعتراضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور تو اور مولوی مملوک العلی صاحب کو ان سے الجھنے میں مزا آتا تھا، یہ بھی مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے تھے کہ اگر ان کا کوئی شاگرد سن لیتا تو مدرسہ سے مولوی صاحب کا سارا رعب داب رخصت ہو جاتا۔

میر صاحب نے شمع کے سامنے بیٹھتے ہی ساری محفل پر ایک نظر ڈالی اور کہا حضرات! میں آج میاں ہدہد کی شان میں ایک قصیدہ سناؤں گا، اپنے منھ میاں مٹھو، یہ اپنی تعریف خود تو بہت کچھ کر چکے ہیں، اب ذرا دل لگا کر اپنی ہجو بھی سُن لیں۔

میاں ہدہد سے سب جلے بیٹھے تھے۔ اب جو سنا کہ ان کی ہجو ہو رہی ہے اور پھر وہ بھی میر صاحب کے منھ سے سب نے کہا میر صاحب ضرور فرمائیے۔ میاں ہدہد حکیم آغا جان عیش کے بیٹھو تھے۔ اور انہی کے بل پر پھدکتے تھے۔ اب جو حکیم صاحب نے سنا کہ میر صاحب ہدہد کی ہجو پر اتر آئے ہیں تو بہت پریشان ہوئے۔ ڈر تھا کہ کہیں مجھ کو بھی نہ لپیٹ لیں دوسرا کوئی ہجو کرے تو جواب بھی دیا جائے، بھلا میر صاحب کی بحر طویل کا کون جواب دے سکتا ہے، اور تو کچھ بن نہ پڑا میاں ہدہد کو گاؤ تکیہ کے پیچھے غائب کر دیا۔ اب جو میر صاحب ادھر نظر ڈالتے ہیں تو ہدہد ندارد ہیں۔ بہت گھبرائے ادھر دیکھا ادھر دیکھا جب کسی طرف نظر نہ آئے تو کہا ہجو ملتوی کر کے اب میں غزل پڑھتا ہوں سب نے کہا ہیں! میر صاحب، یہ آپ نے ارادہ کیوں تبدیل فرما دیا، پڑھیے میر صاحب خدا کے لیے پڑھیے، سودا کے بعد ہجو تو اردو زبان سے اٹھ ہی گئی۔ اگر آپ بھی اس طرف توجہ نہ کریں گے

---

لہ غدر کے بہت بعد میر صاحب کا انتقال ہوا ہے، میاں کالے صاحب کے فرزند نظام الدین صاحب کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اس میں بھی یہ شریک ہوتے تھے اس مشاعرے کے دیکھنے والے اب بھی دہلی میں بہت موجود ہیں انہی لوگوں کی زبانی میر صاحب کے حالات معلوم ہوئے اور درج کر دیے گئے تذکروں میں تو ان بیچارے کا کیوں ذکر آنے لگا۔

تو غضب ہو جائیگا۔ زبان ادھوری رہ جائے گی۔ میر صاحب نے کہا، نا بھئی نا میاں ہد ہد ہوتے تو جو کچھ ہم کو کہنا تھا ان کے منہ پر کہتے۔ ان کے پیٹھ پیچھے ان کو کچھ کہنا ہجو نہیں غیبت ہے اور میں غیبت کرنے والوں پر لعنت بھیجتا ہوں، جب میر صاحب کا یہ رنگ دیکھا تو حکیم آغا جان کے دم میں دم آیا۔ انہوں نے بھی اس ہجو اور غیبت کے فرق کے متعلق چند مناسب الفاظ کہے اور خدا خدا کر کے یہ آئی بلا ٹلی۔

اب میر صاحب نے غزل شروع کی کیا پڑھا خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بس اتنا تو معلوم ہوا کہ، نیر، پیر، کھیر قافیہ اور "ہے" ردیف ہے اس کے علاوہ میں تو کیا خود میر صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ انہوں نے کیا پڑھا اور مضمون کیا تھا۔ جہاں قافیہ اور ردیف آئی لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ہو گیا۔ اور تعریفیں شروع ہوئیں کسی نے ایک آدھ اعتراض بھی جڑ دیا اعتراض ہوا اور میر صاحب کے جوابوں کا رنگ بھی دیکھ لیجیے۔ غزل میں میر صاحب نے جو ایک مصرعہ کو کھینچنا شروع کیا تو اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ہو گیا۔ مولوی مملوک العلی صاحب نے کہا اجی میر صاحب! یہ مصرعہ بحر طویل میں جا پڑا ہے۔ میر صاحب نے کہا، مولوی صاحب کبھی بحر طویل دیکھی بھی ہے یا یوں ہی سنی سنائی باتوں پر اعتراض ٹھونک دیا پہلے مطول[1]، پڑھیے مطول جب معلوم ہو گا بحر طویل کس کو کہتے ہیں، مولوی صاحب بڑے چکرائے کہنے لگے میر صاحب بھلا مطول کو بحر طویل سے کیا واسطہ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ آپ کا جو جی چاہتا ہے کہہ جاتے ہیں۔ میر صاحب کو اب کسی حمایتی کی تلاش ہوئی۔ مولانا صہبائی کی طرف دیکھا انہوں نے کہا، مولوی صاحب! مطول میں بحر طویل کی بحریں نہیں ہیں تو اور کیا ہے آپ بھی ہمارے میر صاحب کو اپنی علمیت کے دباؤ سے خاموش کر دینا چاہتے ہیں۔ بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب شیر ہو گئے کہنے لگے، جی ہاں، مولوی صاحب آپ سمجھتے ہونگے کہ آپ کے سوا کسی نے مطول پڑھی ہی نہیں۔ اجی حضرت میں تو روزانہ اس کے ورد کرتا ہوں

---

[1] علم معانی اور بلاغت پر علامہ تفتازانی کی ایک مشہور تصنیف کا نام مطول ہے۔

کل ہی اس کی ایک بحر میں غزل لکھنے بیٹھا تھا۔ لکھتے لکھتے تھک گیا ایک مصرعہ کوئی پونے دو سو صفحوں میں لکھا۔ وہ تو کہو کہ بیاض کے صفحے ہی ختم ہو گئے جو مصرعہ ختم ہوا ورنہ خدا معلوم اور کہاں تک جاتا۔ مرزا نوشہ نے کہا میر صاحب آپ سچ فرماتے ہیں ہمارے مولوی صاحب نے بحر طویل کہاں دیکھی۔ مجھ سے پوچھو میرے بھتیجے خواجہ اماں کو جانتے ہو۔ اس نے ایک کتاب بوستان خیال لکھی ہے یہ بڑی اور یہ موٹی بارہ جلدیں ہیں، بحر طویل کے بس بارہ مصرعوں میں ساری جلدیں ختم ہو گئی ہیں آپ کا مصرعہ بحر طویل میں نہیں رباعی کی بحر میں ہے، میر صاحب نے بڑے زور سے "ہاہیں" کی اور کہا واہ مرزا صاحب سیدھے چلتے چلتے آپ بھی بھٹک گئے۔ رباعی کی بحریں آپ کو معلوم بھی ہیں، بھلا بتایئے تو سہی کون سی کتاب میں ہیں یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا مرزا غالب ذرا چپ ہوئے تو خود میر صاحب نے کہا۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کر دیا ہے مرزا صاحب! اربعین[1] پڑھئے جب معلوم ہو گا کہ رباعی کی بحریں کون کونسی ہیں

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گذر گیا۔ ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے انہوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کر دیں اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا مشاعرے کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے اور سب لوگ تازہ دم ابھی آکر بیٹھے ہیں جب لوگ اعتراض کرتے کرتے اور میر صاحب جواب دیتے دیتے تھک گئے تو ایک دفعہ ہی میر صاحب نے فرمایا حضرات غزل ختم ہوئی، سب نے کہا میر صاحب! ابھی مقطع تو آیا ہی نہیں، بے مقطع کی یہ کیسی غزل۔ میر صاحب نے فرمایا۔ مقطع کی اس شاعر کو ضرورت ہے جو بتانا چاہے یہ غزل میری ہے ہمیں اسکی ضرورت نہیں، ہماری غزل کی یہی پہچان ہے، جہاں شروع کی بس معلوم ہو گیا کہ یہ میر صاحب کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی، یہ کہتے کہتے انہوں نے جزدان

---

[1] اربعین فی اصول الدین حضرت امام غزالی کی ایک مشہور تصنیف ہے جس کو میر صاحب نے رباعیوں کی بحروں سے متعلق کر دیا۔

گردانا اور اپنی جگہ آ بیٹھے۔ ایک شمع اٹھا کر میر صاحب کے عین مقابل کے شاعر مرزا جمعیت شاہ ماہر کے سامنے رکھ دی گئی، یہ شاہ عالم بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ کے پوتے اور صابر کے شاگرد ہیں۔ کلام صاف اور زبان بڑی میٹھی ٹھنی لکھا ہے۔

ہم بھی ضرور کعبہ کو چلتے پر اب تو شیخ — قسمت سے تنگدہ ہی میں دیدار ہو گیا

ناصح کی بات سننے کا کس کو یہاں دماغ — تیرا ہی ذکر تھا کہ میں ناچار ہو گیا

اے ہمنشیں وہ حضرت ماہر نہ ہوں کہیں — اک یار سا سنا ہے کہ میخوار ہو گیا

میر صاحب کے کلام نے سب کی آنکھوں سے نیند کا خمار اتار دیا تھا۔ اس لیے غزل کی جیسی چاہیئے ویسی تعریف ہوئی اور میاں ماہر کو محنت کا پورا پورا صلہ مل گیا ان کے بعد شمع قاضی نجم الدین برق کے سامنے آئی یہ سکندر آباد کے رہنے والے ہیں، کوئی ۲۰-۲۲ برس کی عمر ہے سر پر لمبے لمبے بال، سانولی رنگت اس میں سبزی جھلکتی ہوئی، اونچا قد، وجیہہ صورت۔ سفید غرارہ دار پجامہ، سفید انگرکھا، دو پلڑی ٹوپی بڑے خوش مزاج، شیریں کلام، ہنس مکھ، بذلہ سنج، وارستہ مزاج، رند مشرب آدمی ہیں، پہلے مومن خاں کے شاگرد تھے پھر ان کے ایما سے میاں تسکین کو کلام دکھانے لگے آواز بڑی دلکش اور طرز ادا خوب ہے۔ غزل بھی ایسی پڑھی کہ واہ واہ! کہتے ہیں سہ

بزم اغیار ہے ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے — ورنہ ایک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہو، ہو جائے

حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے بڑے — ورنہ تو پردہ اٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے

کچھ مزا ہے یہ تیرے روٹھ کے من جانے کا — چاہتا ہوں یونہی ہر روز خفا تو ہو جائے

تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک — میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے

آپ انکار کریں وصل سے میں در گزرا — کچھ تو ہو جس سے طبیعت میری یکسو ہو جائے

ہو ہو بس میں کوئی، کچھ نہیں اس کی پرواہ — دل بیتاب پہ اے برق جو قابو ہو جائے

اللہ اللہ در و دیوار سے بیخودی برس رہی تھی۔ جب یہ مصرعہ پڑھا کہ میں خدا کس کو

بناؤں جو خفا تو ہو جائے ۔" تو ساری محفل پر ایک مستی سی چھا گئی، اور تو اور استادان فن کی بھی یہ حالت تھی کہ بار بار شعر پڑھواتے خود پڑھتے اور مزے لیتے تھے۔

ابھی ان کی تعریفیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ شمع مرزا منجھلے المتخلص بہ فسوں کے سامنے رکھی گئی یہ نوجوان آدمی ہیں، مرزا کریم بخش مرحوم کے فرزند اور حضرت ظل سبحانی کے نواسے ہیں، ان کا کیا کہنا زبان تو ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ گا کر غزل پڑھتے ہیں یا پڑھتے کیا ہیں جادو کرتے ہیں، ان کی غزل کے دو شعر لکھتا ہوں۔

اللہ رے جذبہ دل مضطر کہ تیر کا ۔۔۔ باہر ہمارے پہلو کے سوفار بھی نہیں

کچھ آپ ہی آپ دل یہ میرا بیٹھا جائے ہے ۔۔۔ ظاہر میں تو الٰہی میں بیمار بھی نہیں

دوسرے شعر میں الفاظ بھلے ہیں، نگینے جڑ دیئے ہیں آخر کیوں نہ ہو قلعے کے رہنے والے ہیں۔ ان کے بعد سیدھی جانب سے شمع سرک کر لالہ بالمکند حضور کے سامنے آئی۔ یہ ذات کے کھتری اور خواجہ میر درد کے شاگرد ہیں، کوئی ۷۰، ۸۰ برس کا سن ہے۔ سفید نورانی چہرہ اس پر سفید لباس بغل میں ان کو چھ، کندھوں پر سفید کشمیری دوشالہ، بس جی چاہتا تھا کہ ان کو دیکھتے ہی جایئے، شمع سامنے آئی تو انہوں نے عذر کیا کہ میں اب سنانے کے قابل نہیں رہا۔ سننے کے قابل رہ گیا ہوں۔ جب سبھوں نے اصرار کیا تو انہوں نے یہ قطعہ پڑھا

نہ پاؤں میں جنبش نہ ہاتھوں میں طاقت ۔۔۔ جو اٹھ کھینچیں دامن ہم اس دلربا کا

سر راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے ۔۔۔ کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

قطعہ اس طرح پڑھا کہ خود تصویر ہو گئے "نہ پاؤں میں طاقت" کہتے ہوئے اٹھے مگر پاؤں نے یاری نہ کی لڑکھڑا کر بیٹھ گئے۔ نہ ہاتھوں میں طاقت کہہ کر ہاتھ اٹھائے مگر ضعف سے وہ بھی کچھ یوں ہی سے اٹھ کر رہ گئے دوسرا مصرعہ ذرا تیز تھا تیسرا مصرعہ پڑھتے وقت اس طرح بیٹھ گئے جیسے کوئی بے دست و پا سر راہ بیٹھ کر صدا لگاتا ہے۔ اور ایک دفعہ ہی دونوں آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر جو چوتھا مصرعہ پڑھا تو یہ معلوم ہوتا تھا گویا ساری مجلس پر جادو کر دیا

ہر ایک کے منھ سے تعریف کے بجائے بیساختہ یہی نکل گیا کہ "اللہ والی ہے بیدست دپا کا" استاد ذوق نے کہا، استاد یہ خدا کی دین اور خواجہ میر درد کا فیض ہے۔ سبحان اللہ! کیا موثر کلام ہے ہم دنیاداروں میں یہ اثر پیدا ہونے کے لئے میر درد جیسا ہی استاد چاہیے۔

اس کلام کے بعد مرزا غلام محی الدین اشکی کی غزل بھلا کون نہیں سنتا۔ یہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے پوتے ہیں کوئی چالیس برس کی عمر ہے۔ اونچا قد سفید پوش، ثقہ صورت آدمی ہیں پہلے نظام الدین ممنونؔ سے اصلاح لیتے تھے اب مفتی صدرالدین کے شاگرد ہو گئے ہیں لکھا تھا

کچھ وجہ نہیں نغمہ مطرب ہی پہ موقوف　　　کافی ہے یہاں نالہ بے ربط درا کا
سجدے میں گرے دیکھ کے تصویر تیری اشکیؔ　　　معلوم ہوا آپ کا خرقہ بھی ریا کا

ان کے بعد شمع صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب کے سامنے آئی ۳۰، ۳۲ کا سن ہوگا رامپور کے رہنے والے اور مومن خاں کے شاگرد ہیں، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے بڑی دوستی ہے، انہی کے ساتھ مشاعرے میں آگئے تھے، بڑی اونچی آواز میں غزل پڑھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں غزل تو کچھ اچھی نہ تھی۔ مگر قطعہ ایسا تھا کہ تعریف نہیں ہو سکتی، میخانے کی تقسیم ایسی خوشی سے کی تھی کہ سبحان اللہ، ہائے لکھا ہے۔

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ　　　ساقی اگر نہیں ہے، نہ ہو، مے سے کام ہے
بیتابؔ پی خدا نے تجھے بھی دیئے ہیں ہاتھ　　　یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ یہ جام ہے

بھلا ایسے بڑے مشاعرے میں مرزا فخرالدین حشمتؔ کو پڑھنا کیا ضرور تھا نہ کلام ہی اچھا نہ پڑھنے کی طرز ہی اچھی۔ مگر ان کو روک کون سکتا تھا۔ شہزادے تھے اور وہ بھی شاہ عالم بادشاہ کے پوتے، خیر پڑھ لیا اور بھائی بندوں نے تعریفیں بھی کر دیں خوش ہو گئے، غزل یہ تھی

ترے بیمار ہجراں کا ترے بت　　　یہ عالم ہے کہ عالم نوحہ گر ہے
مجھے روتے جو دیکھا ہنس کے بولے　　　مرے حشمتؔ ترا کیوں چشم تر ہے

ہاں ان کے بعد جس کے سامنے شمع آئی وہ نوجوان سہی مگر شاعر ہے، اور ایسا شاعر ہوگا

کہ ہندوستان بھر میں نام کرے گا۔ بھلا کون سا مشاعرہ ہے جس میں مرزا قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہیں سنی جاتی اور کون سا شعر ہوتا ہے جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا۔ جو ایک دفعہ بھی کسی مشاعرے میں گیا ہے وہ ان کو دور سے پہچان لیگا چھوٹا سا قد دبلے پتلے ہاتھ پاؤں، موٹی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹی جلد، گندمی رنگ اس پر چیچک کے داغ، چھدری چھوٹی سی داڑھی گلوں پر کم ٹھوڑی پر زیادہ، سر پر خشخاشی بال کوئی ۳۰ سال کی عمر بس بخارا کے ترک معلوم ہوتے ہیں ہاں لباس ان لوگوں سے مختلف۔ نیچی چولی کا انگرکھا۔ تنگ مہری کا پیجامہ، سر پر سفید گول ٹوپی، ہاتھ میں سفید لٹھے کا رومال شمع کا ان کے سامنے آنا تھا کہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے انہوں نے بھی انگرکھے کی آستینیں الٹ ٹوپی کو اچھی طرح جما اپنے استاد مرزا غالب کی طرف دیکھا۔ ادھر سے مسکرا کر کچھ اشارہ ہوا تو انہوں نے صاحب عالم کی طرف دیکھ کر عرض کی "اجازت ہے" مرزا فخرو نے کہا ہاں میاں سالک پڑھو۔ آخر اس میں اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے، سالک نے جیب میں سے کاغذ نکالا، کچھ الٹا پلٹا پھر ایک بار سنبھل کر کہا۔ عرض کیا ہے۔

انتہا صبر آزمائی کی ہے درازی شب جدائی کی
ہے برائی نصیب کی، کہ مجھے تم سے امید ہے بھلائی کی
نقش ہے سنگ آستاں پہ ترے داستاں اپنی جبہ سائی کی
ہے فغاں بعد امتحاں فغاں پھر شکایت ہے نارسائی کی
کیا نہ کرنا وصال شادی مرگ تم نے کیوں مجھ سے بیوفائی کی
راز کھلتے گئے مرے سب پر جس قدر اس نے خود نمائی کی
کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں بندے بندے میں بو خدائی کی
رہ گئیں دل میں حسرتیں سالک آگئی عمر پارسائی کی

ایک ایک شعر پر یہ عالم تھا۔ کہ مجلس لوٹی جاتی تھی۔ ایک ایک شعر کئی کئی بار

پڑھوایا جاتا تھا۔ ایک ایک لفظ پر تعریفیں ہوتیں۔ اور ایک ایک بندش کی داد ملتی استاد ذوق نے تیسرے شعر پر کہا۔ واہ میاں سالک کیا کہنا ہے سب ہی جب ساقی باندھتے آئے ہیں۔ تمہاری داستان کو کوئی نہیں پہنچا کیا روانی ہے۔ سبحان اللہ۔ حکیم مومن خاں نے کہا میاں سالک یہ جوانی اور مقطع میں یہ بوڑھا مضمون، تمہاری "عمر یار ساقی" کو بہت دن پڑے ہیں۔ ابھی سے تو بوڑھوں کی باتیں نہ کیا کرو۔ میاں سالک نے جواب دیا۔ استاد میں تو جوانی ہی میں بوڑھا ہو گیا۔ دیکھئے بڑھاپا دیکھنا بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں پھر دل میں آئے ہوئے مضمون کیوں چھوڑ دوں، بعد میں یہ کون دیکھتا پھرے گا کہ یہ شعر بڈھے نے کہا تھا یا جوان نے، ہم نہ رہیں گے مضمون رہ جائے گا۔

جب تعریفوں کا سلسلہ ذرا رکا تو شمع مرزا رحیم الدین ایجاد کے سامنے آئی یہ شہزادے مرزا حسین بخش کے صاحبزادے اور مولانا صہبائی کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۲۴-۲۵ سال کی عمر ہے، شعر کہتے ہیں مگر پھیکے، ہاں پڑھتے بڑی اچھی طرح ہیں گانا خوب جانتے ہیں ان کی آواز شعر کی کمزوری ظاہر ہونے نہیں دیتی۔

بت خانہ میں تھا یا کہ میں کعبہ کے قریں تھا — اے زاہد ناداں تجھے کیا ہے میں کہیں تھا
ہر چند کہ میں دوست کے ہمراہ نہیں تھا — پر دل وہ بلا ہے، وہ جہاں تھا یہ وہیں تھا
توڑا ہے یہ کچھ آپ کو میں نے کہ جہاں میں — ثابت نہ رہا نام کا جو میرے نگیں تھا

غزل میں تو کیا خاک مزا آتا ہاں ان کے گانے میں مزہ آگیا۔ گا کر پڑھنے کا یہ نیا رنگ قلعہ سے چلا ہے، مگر استادان فن اس کو پسند نہیں کرتے۔

ان کے بعد شمع نواب علاء الدین علائی کے سامنے آئی انھوں نے بہت اونچی آواز میں اپنی غزل سنائی علائی مرزا غالب کے بڑے چاہتے شاگرد ہیں ابھی نو عمر ہیں شعر اچھا کہتے ہیں، کیوں نہ ہو کس کے شاگرد ہیں، غزل دیکھ لو استاد کا رنگ غالب ہے۔

آوارگان گلکدۂ آرزو آرزو — حاشا اگر تمہیں سر سیر و فراغ ہے

رکھیو سنبھل کے پاؤں جو بینا ہو چشم دل — کیجو سمجھ کے کام جو روشن دماغ ہے
وہ گُل جو آج ہے قدح موج خیز رنگ — وہ لالہ جو کہ باغ کا چشم و چراغ ہے
گل چو دکل ہے سنگ جفائے سپہر سے — گویا کہ غمکدہ کا شکستہ ایاغ ہے
اور لالہ تند باد حوادث سے خاک و خوں — گویا دل و جگر کا کسی کے وہ داغ ہے
جس جا کہ تھا ترانہ بلبل نشاط خیز — اس جا پہ آج دلشکن آواز زاغ ہے
مغرور جاہ سے یہ کہو تم علانیا — کل ایک سطح خاک ہے جو آج باغ ہے

علائی کے پاس سے شمع کا ہٹ کر سامنے آنا تھا کہ مرزا کریم الدین رسا سنبھل کر بیٹھ گئے ایک بڑی لمبی غزل پڑھی مگر ساری کی ساری بے مزہ نہ الفاظ کی بندش اچھی نہ مضامین میں کوئی خوبی۔ تعقیدوں سے الجھن پیدا ہوتی تھی اور رعایت لفظی سے جی گھبراتا تھا۔ ان کے بس دو ہی شعر نمونہ کے طور پر لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں۔

باز آستا تو مجھ کو بہت عشوہ گر نہیں — کرتا کسی پر ظلم کوئی اس قدر نہیں
گو نزع میں ہوں میں ترے بن آئے جان تن — کرنے کی جان بھی مرے تن سے سفر نہیں

یہ پڑھ چکے تو نواب ضیاء الدین خاں نیر درخشاں کے پڑھنے کی باری آئی فارسی کے شعر خوب کہتے ہیں اردو کی غزلیں ذرا پھیکی ہوتی ہیں۔ لکھا تھا۔

بجلی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں — ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں
شب نہ آئے جو اپنے وعدہ پر — گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں
دل میں مضمر ہیں معنی باقی — کسی صورت نہیں زوال ہمیں
ترے غصہ میں ایک دم ہی کیا — مردہ نہ ہزار سال ہمیں
طالع بد سے نیر رخشاں — اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

ان کے بعد شمع مرزا پیارے رفعت کے سامنے آئی۔ یہ سلاطین زادے ہیں بٹیریں لڑانے کا بہت شوق ہے شعر بھی خوب کہتے ہیں پڑھتے بھی خوب ہیں، پہلے

احسان کے شاگرد تھے اور مولانا صہبائی سے تلمذ ہے کوئی چالیس سال کی عمر ہوگی لکھا تھا

لسانِ طائرِ رنگِ پریدہ وحشت سے کسے دماغ ہے اب آشیاں بنانے کا
نہ عذر تھا ہمیں ہونے میں خاک کے گرہم یہ جانتے کہ وہ دامن نہیں بچانے کا
گندھی تھی کون سے بدمست تشنہ لب کی خاک کہ جس سے خم یہ بنا ہے شراب خانے کا
بندوق نار کو دے رخصت جفا کہ یہاں ہمیں بھی عزم ہے طاقت کے آزمانے کا
ہیں ایک وہ بھی کہ تم سے ہے جن کو لاگ ونیاز اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منھ زمانے کا

آخری شعر میں جو مایوسی کی تصویر کھینچی ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی کوئی نہ تھا جو اس شعر کے دوسرے مصرعہ کو پڑھ پڑھ کر نہ جھومتا ہو اور بار بار واہ واہ اور سبحان اللہ نہ کہتا ہو۔ ہوتے ہوتے میاں عارف کا نمبر آ ہی گیا۔ بھلا ان کو مشاعرے کے انتظام سے کب فرصت تھی جو غزل لکھتے پھر بھی چلتے پھرتے کچھ لکھ ہی لیا تھا وہی پڑھ دیا اس دن رات کی گردش کے بعد اتنا بھی لکھ لینا کمال ہے غزل تھی۔

اٹھتا قدم جو آگے کو اے نامہ بر نہیں تجھے تو چھوڑ آئے کہیں اس کا گھر نہیں
اوروں کو ہو تو ہو ہمیں مرنے سے ڈر نہیں خط لیکے ہم ہی جاتے ہیں گر نامہ بر نہیں
بے التفاتیوں کا تیری شکوہ کیا کریں اپنے ہی جبکہ نالہ دل میں اثر نہیں

مطلع کی سب نے تعریف کی استاد احسان نے کہا، میاں عارف! میں بھی شعر کہتے کہتے بڈھا ہو گیا ہوں لاکھوں شعر سنے لاکھوں سنائے مگر یہ مضمون بالکل نیا ہے اور کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ دل خوش ہو گیا۔

ان عارف کے بعد شمع مرزا غلام نصیر الدین عرف مرزا منجھلے کے سامنے آئی یہ شہزادے ہیں، احسان کے شاگرد ہیں اور قناعت تخلص کرتے ہیں۔ غزل خاصی کہتے ہیں میں تو یہی کہونگا کہ شہزادوں میں بہت کم ایسے شاعر ہوں گے۔ غزل تھی۔

شوق کو کثرت نظارہ سے رشک آتا ہے حشر سے پہلے میسر ہو وہ دیدار مجھے

کعبے تک جانے میں تھی خاطرِ زاہد ورنہ — دیر میں بھی تھی سدا رخصت دیدار مجھے
جنس دزدیدہ کے مانند ہے الجھاؤ میں جان — کہ نہ لیتا ہے نہ پھیرے ہے خریدار مجھے
رازِ دل لب پہ لانا کبھی منظور نہ تھا — کردیا بات کے کہنے نے گنہگار مجھے

شمع کا حکیم آغا جان عیش کے سامنے آنا تھا کہ لوگوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں حکیم صاحب بادشاہی اور خاندانی طبیب ہیں زیور علم سے آراستہ اور لباس کمال سے پیراستہ صاحب اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام، شگفتہ صورت، جب دیکھو یہ معلوم ہوتا کہ مسکرا رہے ہیں طبیعت ایسی ظریف و لطیف اور لطیفہ سنج پائی ہے کہ سبحان اللہ میانہ قد، خوش اندام، سر پر ایک ایک ونگل بال سفید، ایسی ہی داڑھی اس گوری سرخ و سفید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی ہے گلے میں ململ کا کرتہ جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے مگر کچھ دنوں سے ان کے دوست بھی ان سے ذرا کھنچ گئے تھے، میاں ہدہد کو یاں کرانہوں نے سب سے بگاڑ لی، شروع شروع میں تو اسکی واہی تباہی باتوں پر کسی نے دھیان نہیں کیا لیکن جب اس نے استادوں پر حملے شروع کئے اس وقت سے ہدہد کے ساتھ ہی حکیم صاحب سے بھی لوگوں کو کچھ نفرت سی ہو گئی غضب یہ کیا کہ اجمیری دروازے والے مشاعرے میں خود انہوں نے مرزا نوشہ پر کھلا ہوا حملہ کردیا ایک قطعہ لکھا تھا کہ

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے — مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے — مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مولوی مملوک العلی نے کہا حکیم صاحب شعر کے سمجھ میں نہ آنے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو شعر بے معنی ہے یا سمجھنے والے کے دماغ کا قصور ہے۔ ہم سب تو ان کے شعر سمجھتے ہیں پھر آپ نے ساتھ ہم غریبوں کو کیوں لپیٹ لیا۔ مومن خاں نے کہا بھئی مجھے تو اس قطعے کے تیسرے مصرعے میں بھی شاعرانہ غلطی معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس معرکہ کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ حکیم صاحب مشاعرے میں تشریف لائے تھے

میر صاحب نے ہدہد کے مقابلے میں جو اعلان جنگ کیا وہ سن چکے تھے اب لوگوں میں جو کانا پھوسی ہونے لگی اس سے اور بھی پریشان ہوئے پڑھنے میں تامل کیا آخر مرزا فخرو کے اصرار پر یہ غزل پڑھی۔

صلح ان سے ہمیں کئے ہی بنی — دل پہ جھگڑا تھا دل دیئے ہی بنی
زہد و تقوے دھرے رہے سارے — ہاتھ سے اس کے مے پیئے ہی بنی
لائے وہ ساتھ غیر کو ناچار — پاس اپنے بٹھا لئے ہی بنی!
کس کا تھا پاس شوق ظلم اے عیش — ان جفاؤں پہ بھی جیے ہی بنی

جب ایسی غزل ہو تو بھلا کون تعریف نہ کرے صلی علی کے شور اور سبحان اللہ کی آوازوں نے پڑھنے والے اور سننے والے دونوں کے دل سے غبار کدورت دور کر دیا اور حکیم صاحب وہی حکیم صاحب ہو گئے جو پہلے تھے۔ نہ ان سے کسی کو رنج رہا اور نہ ان کو کسی سے ملال۔ ہاں اگر پہلے کہیں میاں ہدہد چوک جاتے تو خدا معلوم مشاعرے کا کیا رنگ ہو جاتا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ہمارے میر صاحب کا کہ انہوں نے پہلے ہی اس پکھیرو کی زبان بند کر دی، خیر رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔

حکیم صاحب کے بعد مرزا رحیم الدین حیاؔ کا نمبر آیا۔ یہ وہی میاں حیاؔ ہیں جن کی تعریف مشاعرے میں آتے ہی ان کے والد صاحب قبلہ مرزا کریم الدین رساؔ نے فرمائی تھی، بڑے خوش طبع، ذہین، نیک فطرت بذلہ سنج گو اور ظریف آدمی ہیں کوئی ۳۵، ۳۶ سال کی عمر ہے، اکثر بنارس میں رہتے ہیں، کبھی کبھی دہلی چلے آتے ہیں شکل تو بالکل شاہزادوں کی ہے مگر داڑھی منڈی ہوئی اور لباس لکھنؤ والوں کا سا پہلے اپنے والد کے شاگرد ہوئے پھر شاہ نصیر سے اصلاح لی اب اپنا کلام استاد ذوقؔ کو دکھلاتے ہیں۔ شطرنج بے مثل کھیلتے ہیں پہلے حکیم شرافت علی خاں سے سیکھی اب مومن خاں کو گھیرے رہتے ہیں ستار ایسا بجاتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شاعر بھی اچھے ہیں مگر محنت

نہیں کرتے زبان کی چاشنی پر مضمون نثار کر دیتے ہیں۔ یہ غزل لکھ کر لائے تھے۔

موت ہے چارہ ساز فرقت ہے — رنج مرنے کا مجھ کو راحت ہے
ہو چکا وصل، وقت رخصت ہے — اے اجل جلد آ کہ فرصت ہے
روز کی داد کون دیوے گا — ظلم کرنا تمہاری عادت ہے
کارواں عمر کا ہے رخصت بدوش — ہر نفس بانگِ کوسِ رحلت ہے
سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے — دم نکلتا نہیں مصیبت ہے
تم بھی اپنے حیاؔ کو دیکھ آؤ — آج اس کی کچھ اور حالت ہے

پانچویں شعر پر ان کے والد نے ٹوکا اور کہا میاں حیاؔ! لکھنؤ جا کر اپنی شکل تو بدل آئے تھے اب زبان بھی بدل دی، سانس کو مونث باندھ گئے، حیا نے جواب دیا جی نہیں قبلہ میں نے تو استاد ذوق کی تقلید کی ہے، وہ فرماتے ہیں۔ سینے میں سانس ہوگی اڑی دو گھڑی کے بعد" بھلا صاحب عالم[1] کب چوکنے والے تھے۔ کہنے لگے۔ بھلا ہمارے مقابلے میں آپ کے استاد کا کلام کہیں سند ہو سکتا ہے جو چاہیں لکھیں، یہ تو قلعے میں سانس مذکر ہے یا مونث بیچارے حیا مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اب شمع مولانا صہبائی کے روبرو آئی۔ ان کی علمیت کا ڈنکا تمام ہندوستان میں بج رہا ہے، ایسے جامع الکمال آدمی کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ہزاروں شاگرد ہیں اکثر ریختہ کہتے ہیں انکو اصلاح دیتے ہیں اور خوب دیتے ہیں مگر خود انکا کلام تمام و کمال فارسی ہے، میں نے تو ریختے میں نہ کبھی کوئی ان کی غزل دیکھی نہ سنی اس مشاعرے میں بھی فارسی ہی کی غزل پڑھی خوب خوب تعریفیں ہوئیں مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو مزہ نہ آیا۔

ہمچو شبنم خویش را فارغ ز عالم ساختم — محرم خورشید گشتم با خاں کم ساختم
مردم و در چشم مردم عالمے تاریک گشت — من مگر شمعم چو رفتم بزم ہم ساختم

---

[1] قلعے والوں کو خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے صاحب عالم کہا جاتا ہے۔

کفر در کیشم سپاس نعمت دیدار اوست — جلوہ در ہر رنگ دیدم گرد نے خم ساختم
جرم عشقم را جزا شد حور و من از ہجر دوست — داغ بر دل بردم و خلدش جہنم ساختم
نیست صہبائی چو جام جم نصیبم گو مباد — مے ز خون دل کشیدم خویش را جم ساختم

مقطع پر تو اتنی تعریفیں ہوئیں کہ بیان سے باہر ہے، مگر جو بیچارے فارسی نہیں سمجھتے تھے بیٹھے منہ دیکھا کیے، صاف بات تو یہ ہے کہ اردو کے مشاعرے میں فارسی کا ٹھونسنا کچھ مجھے بھی پسند نہ آیا۔

آہا ہا ہا! زبان کا لطف اٹھانا ہے تو اب سید ظہیر الدین خاں ظہیر کو سنیے ابھی ۲۰، ۲۲ سال کی عمر ہے۔ مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ہے کہ واہ واہ استاد ذوق کی اصلاح نے اور سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ مشکل صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی طبیعت اس بلا کی ہے، قد خاصا اونچا چھریرا بدن، کشادہ سینہ سانولی رنگت، کشادہ دہن اونچی ستواں ناک آنکھیں نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی۔ مگر گول داڑھی نہ بہت گھنی نہ بہت چھدری، سر پر پٹے، لباس میں انگرکھا، تنگ مہری کا سفید پاجامہ سر پر سفید گول ٹوپی خوش مزاج اور لطیفہ سنج ایسے کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ پڑھنے کا بھی ایک خاص طرز ہے لکھنؤ والوں کے تحت اللفظ پڑھنے سے ملتا جلتا ہے ساتھ ہی اشاروں سے ایک لفظ کو سمجھاتے جاتے ہیں، غزل ہوتی تھی۔

جبیں، اور شوق اس کے آستاں کا — ارادہ، اور ارادہ بھی کہاں کا
لٹا ہے قافلہ تاب و تواں کا — خدا حافظ ہے دل کے کارواں کا
مری درماندگی منزل رساں ہے — سراغ نقش پا ہوں کارواں کا
رہے پابند دل کے دل میں ارماں — قدم منزل تھے پکڑا کارواں کا
اٹھا سکتے نہیں سر آستاں سے — غضب ہے بار منت پاسباں کا
ہمیشہ مورد برق و بلا ہوں — مٹے جھگڑا الٰہی آشیاں کا

دلِ بے تاب نے وہ بھی مٹایا کسی کو جو کچھ دھوکا تھا فغاں کا
ظہیرؔ آؤ چلو اب میکدے کو نکالا زہد و تقوے ہے کہاں کا

اور تو اور استادان فن نے اس غزل کی ایسی داد دی کہ میاں ظہیر کا دل غنچے کی طرح کھل گیا۔ تیسرے شعر پر تو یہ حالت تھی کہ تعریفوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا سلام کرتے کرتے بیچارے کے ہاتھ دکھ گئے ہونگے جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی جانب کی شمع نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے سامنے آئی، ان کا کیا کہنا استادان فن میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مومن کے شاگرد ہیں مگر خود استاد ہیں۔ انہوں نے کسی شعر کی تعریف کی اور اس کی وقعت بڑھی، یہ سن کر ذرا خاموش ہوئے اور شعر دوسروں کی نظر سے بھی گر گیا زبان کے ساتھ مضمون کو ترتیب دینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ پڑھتے بھی ہیں تو ایک لفظ سمجھا سمجھا کر۔ آواز ایسی اونچی ہے کہ دور اور پاس سب کو صاف سنائی دے غزل پڑھنے سے پہلے ادھر اُدھر دیکھا ذرا انگرکھا درست کیا، ٹوپی درست کی انگرکھے کی آستینوں کو چڑھایا اور یہ غزل پڑھی۔

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
سب اس میں محو اور یہ سب سے علیحدہ آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں
ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہیئے جوں آفتاب و روشنیٔ آفتاب میں
وہ قطرہ ہوں کہ موجہ دریا میں گم ہوا وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں
مُلک شیوہ، شوخ طبیعت زبان دراز لازم ہوا ہے پر نہیں عاجز جواب میں
تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو، مگر حضور اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

غزل تو ایسی ہے کہ بھلا کسی کا منھ ہے جو تعریف کا حق ادا کر سکے، مگر تعریف بڑی سنبھل سنبھل کر کی گئی۔ بڑے مشاعروں میں میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ نومشقوں کے دل تو ہمیشہ تعریفوں سے خوب بڑھاتے ہیں۔ مگر جب استادوں کے پڑھنے کی نوبت

آئی ہے تو وہ جوش و خروش نہیں رہتا بلکہ جوش کے بجائے متانت زیادہ آجاتی ہے استادوں کے انھیں شعروں کی تعریف ہوتی ہے جو واقعی قابل تعریف ہوں، اگر کسی شعر کی ذرا بیجا تعریف کردی جائے تو اس سے ان کو تکلیف ہوتی ہے یہ صرف اسی کلام کی تعریف چاہتے ہیں۔ جس کو یہ خود سمجھتے ہیں کہ اس کی تعریف ہونی چاہئے شعر پڑھ کر اگر دیکھتے بھی ہیں تو اپنے برابر والوں کی طرف اور وہی داد بھی دیتے ہیں مشاعرے کے باقی لوگ ان کے کلام سے لطف ہی نہیں اٹھاتے کچھ حاصل بھی کر لیتے ہیں اور ان کے لئے یہ غزلیں استاد کی اصلاح سے کم فائدہ مند نہیں ہوتیں۔

ان کے بعد شہزادہ مرزا قادر بخش صابر کی باری آئی، یہ کوئی ۴۰ برس کے ہونگے ان کی شاعری کی قلعہ میں بڑی دھوم ہے، خود ان کو بھی اپنے کلام پر ناز ہے شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھ رہے ہیں۔ مگر مشہور یہ ہے کہ الف سے لے کر یے تک مولانا صہبائی کا قلم ہے۔ یہ سچ ہے یا جھوٹ خدا بہتر جانتا ہے۔ خود انھوں نے اپنے حالات ایک قطعہ میں لکھتے ہیں، وہ نقل کرتا ہوں۔

## قطعہ

پہلے استاد تھے احسان و نصیر و ممنون　　ہوئی احسان سے اصلاح طبیعت میری
پھر ہوا حضرت صہبائی کی اصلاح کا فیض　　طبع باریک ہوئی ان کی بدولت میری
اور ہم بزم رہے مومن و ذوق و غالب　　اوستادوں ہی سے ہر دم رہی صحبت میری
ہند کا فضل و ہنر ذات یہ ہے جن کی تمام　　مانتے ہیں وہی اشخاص فضیلت میری
منعقد ہوتی ہے جب شہر میں بزم انشار　　کرتے ہیں اہل سخن وقعت و عزت میری

اب اس کلام پر ان کو استاد کہو یا جو جی چاہے کہو۔ غزل بھی یہی پھیکا رنگ ہے مضمون بھی کچھ بلند پایہ نہیں، مگر سارا شہر ان کو استاد مانتا ہے۔ ہوں گے ممکن ہے میری ہی سمجھ کا پھیر ہو۔ غزل کہی تھی۔

نظارہ برق حسن کا دشوار ہوگیا — جلوہ حجاب دیدۂ بیدار ہوگیا
محفل میں، میں اس لب میگوں کے سامنے — نام شراب لے کے گنہگار ہوگیا
حائل ہوئی نقاب تو ٹھہری نگاہ شوق — پردہ ہی جلوہ گاہ رخ یار ہوگیا
معلوم یہ ہوا ہے کہ پرسش گناہ کی — عاصی کنہ نہ کردہ گنہگار ہوگیا
اس کی گلی میں آن کے کیا کیا اٹھائے رنج — خاک شفا ملی تو میں بیمار ہوگیا
پیری میں ہم کو قطع تعلق ہوا نصیب — قامت خمیدہ ہوتے ہی تلوار ہوگیا

یہ پڑھ چکے تو شمع مفتی صدر الدین صاحب آزردہ کے سامنے پہنچی اس پایہ کے عالم شاعر نہیں ہوتے اور ہوتے ہیں تو استاد ہو جاتے ہیں مفتی صاحب کے جتنے شاگرد جید عالم ہیں اس سے کہیں زیادہ انکے تلامذہ شاعر ہیں اور شاعر بھی کیسے بڑے پایہ کے مفتی صاحب کہتے تو خوب ہیں مگر پڑھتے اس طرح ہیں گویا طالب علموں کو سبق دے رہے ہیں، آواز بھی ذرا نیچی ہے۔ لیکن ان کی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہوتا ہے، اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص خاص شعروں پر اور بہت نیچی آواز میں ہاں مرزا نوشہ ان سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھے ہیں اور مزے مزے کی نوک جھونک ہو جاتی ہے غزل ملاحظہ ہو کیا پختہ کلام ہے۔

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں — کب آسمان زمین و زمین آسمان نہیں
افسردہ دل نہ ہو در رحمت نہیں ہے بند — کس دن کھلا ہوا در پیر مغاں نہیں
شب اسکو حال دل نے جتایا کچھ اس طرح — ہیں لب تو کیا نگہ بھی ہوئی ترجماں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں — اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
کٹتی کسی طرح بھی نہیں یہ شب فراق — شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں
کہتا ہوں اس سے کچھ میں نکلتا ہے منہ سے کچھ — کہنے کو یوں تو ہے گی زباں اور زباں نہیں
آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اس کے روبرو — مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

آزردہ جیسے استاد کے بعد نواب مرزا خاں داغ کا پڑھنا ایک عجیب سی چیز ہے۔ مگر یہ بات ہے کہ اول تو داغ کو سب جانتے ہیں، دل بڑھاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہ داغ ہندوستان کا چراغ ہوگا، دوسرے مرزا فخرو کے خیال سے ان کو استادوں میں جگہ ملی تھی۔ مگر انھوں نے غزل بھی ایسی پڑھی کہ استاد بھی قائل ہو گئے، ۱۷، ۱۸ برس کے لڑکے کا اس قیامت کی غزل اور اس جرأت سے پڑھنا واقعی کمال ہے، میری تو یہ رائے ہے کہ جو زبان داغ نے لکھی ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہو گی۔ ذرا زبان کی شوخی مضمون کی رنگینی اور طبیعت کی روانی ملاحظہ کیجیے اور داد دیجیے۔

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رو آپ گو ہوئے لیکن لطف سوز و گداز کیا جانیں
کب کسی در کی جبہ سائی کی شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جو رہ عشق میں قدم رکھیں وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھیے میکشوں سے لطف شراب یہ مزہ پاکباز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں اب تک وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
حضرت خضر جب شہید نہ ہوں لطف عمر دراز کیا جانیں
جو گذرتے ہیں داغ پر صدمے آپ بندہ نواز کیا جانیں

اللہ اللہ! وہ سہانا وقت، وہ چھوٹی سی آواز، وہ دلکش سُر، وہ الفاظ کی نشست و بندش کی خوبصورتی اور سب سے زیادہ یہ کہ داغ کی بھولی بھالی شکل ایک عجیب لطف دے رہی تھی۔ ساری محفل میں کوئی نہ تھا جو محو حیرت نہ ہو گیا ہو اور کوئی نہ تھا جس کے منہ سے جزاک اللہ، سبحان اللہ اور صلے علیٰ کے الفاظ بے ساختہ نہ نکل رہے ہوں مرزا فخرو کی تو یہ حالت تھی کہ گھڑی گھڑی پہلو بدلتے اور دل ہی

دل میں خوش ہوتے تھے، غزل ختم ہوئی اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کب ختم ہوگئی، جب شمع حکیم مومن خاں کے سامنے پہنچ گئی۔ اس وقت لوگوں کا جوش کم ہوا۔ اور اس رنگیلے استاد کا کلام سننے کو سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ انھوں نے شمع کو اٹھا کر ذرا آگے رکھا، ذرا سنبھل کر بیٹھے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی، ٹوپی کو کچھ ترچھا کیا آستینوں کی چنٹ کو صاف کیا اور بڑی دردانگیز آواز میں دلپذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی۔

الٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذر جفا کے ساتھ

بہر عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آواز پا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر
یوں روئے زار زار تو اہل عزا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

اس کی گلی کہاں، یہ تو کچھ باغ خلد ہے
کس جائے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

اللہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو ایک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی ایک جادو تھا، تمام لوگ ایک عالم محویت میں بیٹھے تھے وہ خود بھی اپنے کلام کا مزا لے رہے تھے جس شعر میں ان کو زیادہ لطف آتا تھا اسکو پڑھتے وقت ان کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں بہت خوش ہوا تو زلفوں کو انگلیوں میں بل دے کر موڑنے لگے۔ کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر ذرا مسکرا دیئے۔ پڑھنے کا طرز بھی سب سے جدا تھا۔ ہاتھ بہت کم ہلاتے تھے اور ہلاتے بھی کیسے ہاتھوں کو بالوں سے کب فرصت تھی۔ ہاں آواز کے زیروبم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کر جاتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعرا نے تعریف کی یہ سن کر مسکرائے اور کہا آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے۔ میں تو

عرض کر چکا ہوں۔

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالب زر کچھ | تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

ان کے بعد شمع استاد احسان کے سامنے آئی، میں سمجھا تھا کہ ان کی آواز کیا خاک نکلے گی، مگر شمع پہنچتے ہی وہ تو کیچلی سی بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے اور اتنی بلند آواز سے غزل پڑھی کہ تمام مجلس پر چھا گئے کسی شعر پر مومن خاں کو متوجہ کرتے کسی پر مرزا نوشہ کو، کسی پر استاد ذوق کو ان کی عظمت کچھ لوگوں کے دلوں پر ایسی چھائی ہوئی تھی کہ جس کو انھوں نے متوجہ کیا اس کو تعریف کرتے ہی بنی، ردیف سخت اور قافیہ مشکل تھا مگر ان کی استادی کی داد دینی چاہیے۔ کہ ان دشواریوں پر بھی ساری کی ساری غزل مرصع کہہ گئے ہیں۔ ہائے لکھتے ہیں۔

تو کیوں ہے گریہ کناں اے مرے دل محزون | نہ رو رو کہ نہ تجھ کو کبھی رلائے خدا
اتبو بتاؤ تو، کیا تم خدا کو دو گے جواب | خدا کے بندوں پہ یہ ظلم بندہ ہائے خدا
رضا پہ تیری ہوں دن رات اے صنم مصروف | جو اس پہ تو نہیں راضی نہ ہو رضائے خدا
بتوں کے کوچے میں کہتا تھا کل یہی احسان | یہاں کسی کا نہیں ہے کوئی سوائے خدا

جب یہ پڑھ چکے تو مرزا غالب کی باری آئی۔ یہ رنگ ہی دوسرا تھا صبح ہو چلی تھی شمع کے سامنے آتے ہی فرمانے لگے "صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں یہ کہہ کر ایسے دلکش اور موثر لہجہ میں غزل پڑھی کہ ساری محفل محو ہو گئی، آواز بہت اونچی اور پر درد تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی کو مجلس میں اپنا قدر داں نہیں پاتے اور اس لئے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی غزل تھی۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے | آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار | یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منھ میں زبان رکھتا ہوں | کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود / پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں / غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے / نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں / ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید / جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا / اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں / میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ / مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

غزل پڑھ کر مسکرائے اور کہا "اب اس پر بھی نہ سمجھیں وہ تو پھر ان سے خدا سمجھے" حکیم آغا جان سمجھ گئے، اور کہنے لگے مرزا صاحب! غنیمت ہے کہ تم اس رنگ کو آخر ذرا سمجھے، غرض تعریفوں کے ساتھ مذاق بھی ہوتا رہا۔ اور شمع استاد ذوق کے سامنے پہنچ گئی۔ استاد نے مرزا فخرو کی طرف دیکھ کر کہا۔ صاحب عالم غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں۔ کل رات خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی طرح نیند ہی نہ آتی تھی لوٹتے لوٹتے صبح ہوگئی شب ہجر کا مزہ آگیا۔ اسی کشمکش میں ایک قطعہ ہوگیا ہے، اجازت ہو تو عرض کروں مرزا فخرو نے کہا۔ استاد آج کا مشاعرہ سب بندوں سے آزاد ہے، غزل پڑھیے، رباعی پڑھیے قصیدہ پڑھیے، قطعہ پڑھیے غرض جو دل چاہے پڑھیے ہاں کچھ نہ کچھ پڑھیے ضرور، استاد سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور قطعہ ایسی بلند اور خوش آیند آواز میں پڑھا کہ محفل گونج اٹھی اور ان کے پڑھنے کے انداز نے کلام کی تاثیر میں اور زیادہ زور پیدا کر دیا۔

کہوں کیا ذوقؔ احوال شب ہجر / کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
سمی شب ڈال رکھا تھا اندھیر / مرے بخت سیہ کی تیرگی نے

تب غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم | اور آتے تھے پسینوں پہ پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے | کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ شب مگر تھے | مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سوا اس ظلمت کے پردے میں کئے ظلم | ارے ظالم تیری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج | پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قرین تھے | قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سن کر | پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا | مجھے بیتابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ | بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ | بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی | طلوع صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات | یقین ہے صبح تک دے گی نہ جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آنسو | پڑھی یاسین سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی | لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے | اذان مسجد میں دی یا رب کسی نے
بشارت مجھ کو صبح وصل نے دی | اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر | کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے
موذن مرحبا بر وقت بولا | تری آواز مکے اور مدینے

آخری شعر پر پہنچے تھے برابر کی مسجد سے آواز آئی اللہ اکبر، اللہ اکبر! اللہ اکبر! اس کے ساتھ ہی سب کے منھ سے نکلا "تری آواز مکے اور مدینے" اذان ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ اٹھائے، دعا سے فارغ ہو کر مرزا فخرو نے کہا صاحبو!

کچھ عجیب اتفاق ہے کہ فاتحہ خیر ہی سے یہ مشاعرہ شروع ہوا تھا اور اب فاتحہ خیر ہی پر ختم ہوتا ہے، یہ کہہ کر انھوں نے دونوں شمعوں کو جو چکر کھا کر ان کے سامنے آگئی تھیں بجھا دیا شمعوں کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی۔

حضرات مشاعرہ ختم ہوا۔ یہ سننا تھا کہ چلنے کو سب کھڑے ہو گئے سب سے پہلے مرزا فخرو سوار ہوئے اور پھر ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے آخر میں میں اور نواب زین العابدین خاں، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے میاں کریم الدین یہ تمھاری نیک نیتی تھی جو اتنا بڑا مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہوا تمھارا کام بھی بن گیا اور میرا ارمان بھی نکل گیا:

(اچھا خدا حافظ)

## تقدیر

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں　　جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

دوسرے روز سب سامان اٹھ گیا اور پھر وہی چھاپہ خانہ کی گھڑ گھڑ اور پریسمینوں کی گڑبڑ شروع ہو گئی، میں نے دوسرے مہینے پھر مشاعرے کا اعلان کیا تھا اشتہار بھی تقسیم کیے، مگر گنتی کے آدمی آئے، آخر یہ مجلس بند کرنی پڑی کچھ تو مطبع کے کام میں نقصان ہوا کچھ ملازمین میں تنگی رقمیں دبا بیٹھے، غرض تھوڑے ہی دنوں بعد میرے دو چار جاہل شرکاء نے مجھ سے فریب کر کے مطبع چھین لیا۔

ہر چند کہ میں نے سوچا تھا کہ اگر دعویٰ کروں، حاکم بے شک میرا انصاف کرے گا لیکن چند صدمات پڑ جانے کی وجہ سے وہ ارادہ بھی پورا نہ ہوا اس مشاعرے کی کیفیت کے مسودات پڑے رہ گئے ہیں، دیکھیے کب چھپتے ہیں اور کون چھاپتا ہے فقط

ختم شد

ALLAMA IQBAL LIBRARY
56290

J. & K. UNIVERSITY LIB
Acc. No. 56290
Date 2.3.65

علمی ادبی کتب میں ایک اور شاندار اضافہ

# اردو رباعیات

فن رباعیات پر ڈاکٹر سلام سندیلوی کا شاہکار
اردو میں اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے
جسے شائع کرنے کا فخر
نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے حاصل کیا ہے

ہر اسکول و کالج کی لائبریری میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے اس لئے کہ قابل مؤلف نے رباعیات کے فن پر صدہا کتب کا مطالعہ کر کے یہ کتاب مرتب کی ہے جو اس بحث پر حرف آخر ہے۔ قیمت مجلد: بارہ روپے — ناشر: نسیم بکڈپو لکھنؤ

THE UNIVERSITY OF KASHMIR
ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN